معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۲۰/روپے   فی شمارہ ۱۲/روپے

پاکستان میں سالانہ ۳۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ   ہوائی ڈاک پچیس پونڈ یا چالیس ڈالر

بحری ڈاک نو پونڈ یا چودہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ---- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

فہرست ششماہی

مضمون نگاران معارف

۱۷۹ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۷ء تا ماہ جون ۲۰۰۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست ششماہی

مضامین معارف

۱۷۹ ویں جلد

ماہ جنوری ۲۰۰۷ء تا ماہ جون ۲۰۰۷ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۷۹ ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۷ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۰۷ء عدد ۱

فہرست مضامین

ای میل : email : shibli_academy@rediffmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور سیاسی زوال و انحطاط کے حد انتہا کو پہنچ جانے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، اب اس پر مباحثہ وانتظار ہو رہا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے ادبار وفلاکت کو دور کرنے کا واقعی کچھ سامان کرے گی یا ان کے دوسرے معاملات کی طرح یہ معاملہ بھی چند دنوں تک بحث و گفتگو کا موضوع رہ کر نقش ونگار طاق نسیاں ہوجائے گا، ہم یہ مانتے ہیں کہ اس بدترین حالت تک ان کو پہنچانے میں زیادہ دخل ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے تعصب، دوہرے معیار، جانب دارانہ اور غیر منصفانہ رویے کو ہے لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ خود مسلمان بھی اپنی پس ماندگی کے لئے کس حد تک ذمہ دار اور قصوروار ہیں جن کی بنا پر وہ من حیث القوم تعلیم سے محروم، معیشت میں تباہ اور سیاست میں کنارے پر آگئے ہیں، جن لوگوں کو تعلیم، معیشت، ملازمت، تجارت، سیاست، قیادت، زراعت، فلاحت اور صنعت وحرفت میں آگے بڑھنے کے مواقع میسر تھے انہوں نے نہ ان مواقع سے خود فائدے اٹھائے اور نہ اپنے ہم قوموں کو ان سے فائدے اٹھانے کے وسائل وذرائع مہیا کئے اور اندیشہ ہے کہ سچر کمیٹی کی بہ دولت بھی اگر کچھ مواقع ہاتھ آئے تو یہ اسے بھی گنوا دیں گے، افسوس اور سخت افسوس ہے کہ مسلمانوں کے طبقۂ اشراف اور اولو بقیہ نے ساٹھ برس کا زمانہ سیاسی بازی گروں کے تملق، خوشامد اور انہیں خوش کرنے میں گزار کر اپنا قومی زیاں کیا، خوئے غلامی کو اپنا شیوہ بنا کر پوری قوم کو غلامانہ ذہنیت کا عادی اور کاسہ گدائی لینے پر مجبور کردیا۔

سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حیثیت سے قطع نظر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں میں یہ سخت دینی، روحانی اور اخلاقی بحران کیوں ہے؟ ان کی مذہبی زندگی کا سارا نظام درہم برہم کیوں ہے؟ اپنے دین سے ان کا تعلق اس قدر کمزور کیوں ہے؟ دین سے ان کی نفرت وبیزاری کیوں بڑھ گئی ہے؟ جو اخلاقی خوبیاں اور اوصاف ومحامد ان کا طغرائے امتیاز تھا، وہ ان میں معدوم کیوں ہوگیا ہے، کون سے معائب ومفاسد ہیں جو ان میں نہیں ہیں اور کون سے فواحش ومنکرات ہیں جن میں وہ ملوث نہیں ہیں، جرائم اور بدکاریاں ان کی گھٹی میں داخل ہوگئی ہیں، جن لعنتوں اور بدعنوانیوں نے ملک کی چولیں ہلادی ہیں کیا وہی مسلمانوں کو بھی کھوکھلا نہیں کررہی ہیں، حکومت کے جن شعبوں میں عموماً صرف مسلمانوں کا عمل دخل ہے جیسے اوقاف، اقلیتی فلاح وبہبود کے محکمے، مدرسہ بورڈ، فروغ اردو کونسل،

اردو اکیڈمیاں وغیرہ، جن وزارتوں اور شعبوں میں اکا دکا مسلمان ہیں کیا وہ بدعنوانیوں اور لوٹ کھسوٹ سے پاک ہیں، یہ سب ادارے سرکاری ہیں لیکن مسلمانوں کے جو ادارے ہیں، یہاں تک کہ دینی مدارس و مکاتب، کیا ان کی حالت بہتر ہے؟ کیا مسلمانوں کے اس روحانی واخلاقی بحران کی ذمہ دار بھی حکومتیں ہیں؟ مسلمان تو خیر امت ہیں، ان کے خیر وبرکت کے نور سے ان کے اپنے اداروں کو تو جگمگانا، صاف ستھرا اور بدعنوانیوں سے پاک ہونا چاہئے تھا مگر جب وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے تو ان کا معاشی و تعلیمی بحران اور سیاسی استحصال تو درکنار وہ اپنے ایمان وعمل اور اخلاقی محاسن سے بھی عاری ہوگئے۔

ہم ان صفحات میں متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ دارالمصنفین کی کتابیں ہندوستان و پاکستان کے ناشرین غیر قانونی وغیر اخلاقی طور پر شائع کررہے ہیں مگر ہماری چیخ پکار کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آرہے ہیں، حال میں دہلی سے ہمارے ایک کرم فرمانے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر دارالمصنفین کتابت وطباعت کے جدید معیار وانداز کے مطابق اپنی کتابیں شائع نہیں کرے گا تو دوسرے اس کی کتابیں اسی طرح چھاپتے رہیں گے، ہم اپنے کرم فرما کے شکر گزار ہیں مگر اس کا وہ سبب نہیں ہے جو انہوں نے سمجھا ہے بلکہ وہ دینی واخلاقی بحران ہے جس نے مسلمان ناشرین کو چوری اور قزاقی کے لئے ڈھیٹ بنادیا ہے، خدا کے فضل وکرم سے چند برسوں میں دارالمصنفین نے اپنی کئی درجن کتابوں کو جدید طباعتی معیار کے مطابق شائع کیا ہے اور سیرۃ النبی کی ساتوں جلدیں تو بہت عمدہ چھپی ہیں مگر ان کو بھی یہ ناشرین شائع کررہے ہیں، قارئین معارف کو یاد ہوگا کہ ان صفحات میں دارالمصنفین کے اس منصوبے کا بھی بار بار اعلان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ساری کتابیں آفسٹ پر شائع کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے لئے اس کے مصارف کا یک بارگی متحمل ہونا دشوار ہے، اس لئے ارباب خیر اس میں اس کا تعاون کریں، سیرۃ النبی کے تمام حصے اور مولانا شبلی کی بعض تصانیف اسی طرح شائع بھی ہوئیں، دارالمصنفین نے زیر بار ہوکر آفسٹ پریس خریدا ہے اور اب اس کے لئے باہر کی چیزیں بھی شائع کرنا ممکن ہوگیا ہے، غرض معیارِ طباعت بلند کرنے سے وہ غافل نہیں ہے، البتہ وسائل کی کمی ہر کام میں مانع بن جاتی ہے۔

علامہ شبلی مرحوم نے دارالمصنفین سے معارف کے اجرا کا جو پروگرام بنایا تھا وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے ذریعہ روبہ عمل آیا اور جولائی ۱۹۱۶ء میں اس کا پہلا شمارہ نکلا اور الحمد للہ اس وقت سے اب تک یہ مسلسل بلاناغہ شائع ہورہا ہے، ۹۰ سال تک اردو کے اور وہ بھی ایک سنجیدہ علمی وتحقیقی رسالہ کا جس میں عام دل چسپی کی چیزیں نہ ہوں شائع ہوتے رہنا خدائے ذوالجلال کا فضل وکرم ہے، معارف کا

شروع سے جو بلند معیار و انداز رہا ہے اسے قائم رکھنا مجھ جیسے کم مایہ کے لئے بہت مشکل ہے مگر ہمیشہ میری یہ کوشش رہی کہ اس کے معیار کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، اگر اس میں کچھ کامیابی ہوئی ہو تو یہ تائید ربانی اور اہل علم و دانش کی اعانت سے ہوئی ہے لیکن اب لوگ سہولت پسند ہو گئے ہیں اور محنت و پتہ ماری سے گھبراتے ہیں، جن موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں ان کے اصل مراجع سے واقف نہیں ہوتے، اردو زبان کا ذخیرہ وسیع ہو گیا ہے اس سے مضمون تیار کر لیتے ہیں لیکن اس کے بجائے اصل ماخذ کا حوالہ دیتے ہیں، اصلی مآخذ کی موجودگی میں ثانوی اور ضمنی مآخذ کا حوالہ دینا بھی معمول ہوتا جا رہا ہے، بعض لوگ حوالے دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے، موضوعات ایسے منتخب کئے جاتے ہیں جن میں کم محنت و تحقیق کرنا پڑے، بعض حضرات اخباری مضامین لکھتے ہیں، انہیں معارف کا خیال آ جاتا ہے تو اخباری مضمون اسے بھی بھیج دیتے ہیں، معارف کا مقصد نوجوان اور ہونہار اہل قلم کی تربیت بھی ہے وہ ان باتوں پر توجہ دیں۔

اقبال اکادمی پاکستان، لاہور کا ایک فعال ادارہ ہے جو اقبالیات پر بلند پایہ کتابوں کی اشاعت کے لئے مشہور ہے، علم دوستی کی بنا پر اس کی مطبوعات دارالمصنفین کے حصے میں بھی آتی ہیں، دسمبر ۲۰۰۶ء میں حسب ذیل کتابیں ملی ہیں: اقبال اور قرآن (ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں) طبع ششم ۲۰۰۶ء، اقبال اور محبت رسول (ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی) طبع ششم ۲۰۰۶ء، اقبال (احمد دین مرتبہ مشفق خواجہ) طبع چہارم ۲۰۰۶ء، پروفیسر محمد منور بہ طور اقبال شناس (زبیدہ جبیں) طبع اول ۲۰۰۶ء، میار ابزم ساحل کے آنچا (محمد سہیل عمر......) طبع اول ۲۰۰۶ء، جو خطبات اقبال کے بارے میں ساحل میں چھپنے والی تحریروں کا محاکمہ ہے، اقبالیات تفہیم و تجزیہ (رفیع الدین ہاشمی) طبع اول ۲۰۰۴ء، محمد یونس حسرت کی دو کتابیں حکایات اقبال (بچوں کے لئے) اور (جوانوں کے لئے) دونوں طبع اول ۲۰۰۶ء اور محمد نوید مرزا نے اشعار و کلام اقبال پر مبنی بچوں کے لئے سراغ زندگی اور مقدر کا ستارہ مرتب کی ہیں، تین کتابیں انگریزی میں ہیں ایک اقبال کی مصور سوانح عمری خرم علی شفیق کی اور جاوید نامہ اقبال حنا تنویر کی مرتب کی ہوئی ہے جسے تبسم خالد نے مصور شکل دی ہے اور تیسری کتاب اقبال کی پرائیوٹ نوٹ بک کو ڈاکٹر جاوید اقبال نے مرتب کیا ہے، ان کتابوں کی اشاعت کے لئے ہم اکادمی کو مبارک باد دیتے ہیں اور عطیے کے لئے اس کے شکر گزار ہیں۔

☆☆☆☆☆

مقالات

یحییٰ حقّی کا تنقیدی اور فنی شعور[1]

از:- پروفیسر محمد راشد ندوی☆

انسان اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھتا، پڑھتا اور سنتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ بہت سی چیزیں جن کو اس نے پڑھا ہے یا بہت سے واقعات جن سے وہ گزرا ہے یا بہت سی باتیں جن کو اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے سنا ہے، وہ سب ختم ہو جاتی ہیں لیکن ایسا نہیں ہے، انسان کے ذہن کے گوشے میں یہ باتیں موجود رہتی ہیں اور اچانک یہ باتیں سامنے آ جاتی ہیں، جو اس کی زندگی کے لئے منارۂ نور ثابت ہوتی ہیں، یا اس سے زندگی کی بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں، یہی معاملہ میرے ساتھ یحییٰ حقی کا ہے، ۱۹۵۴ء کی بات ہے جب میں دارالعلوم ندوۃ العلما میں تخصص کا طالب العلم تھا اور میرے استاذ و مربی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مجھے سید قطب شہیدؒ کی کتاب "کتب و شخصیات" ازراہ محبت عنایت فرمائی تھی، اس کتاب میں سید قطب نے یحییٰ حقی کے ناول "قندیل ام ہاشم" پر بہت ہی عالمانہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا ہے جس میں یحییٰ حقی کے فکر و فن اور زبان و ادب کا غیر معمولی اعتراف کیا ہے، سید قطب خود ادیب اور ناقد تھے، اس لئے ان کی ہر تحریر میں ادیبانہ اور ناقدانہ رنگ رہتا ہے، یہ مضمون میں نے پڑھا تھا اس کے بعد یحییٰ حقی کی کوئی چیز میں نے نہیں دیکھی تھی، چند دنوں کے بعد مجھے شام کا سفر کرنا پڑا جہاں مجھے دمشق یونی ورسٹی میں پڑھنے کا موقع نصیب ہوا، دمشق میں عرصے تک میرا قیام رہا، جہاں شام کے ادیبوں اور ناقدوں سے

---

[1] یہ مقالہ شعبۂ عربی اے۔ ایم۔ یو۔ میں ۱۷-۱۹؍ مارچ ۲۰۰۶ء میں منعقد کئے گئے "عربی تنقید نگاری" سیمینار میں پیش کیا گیا۔

☆ سابق صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی۔

تعارف ہوا اور ان کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، جن میں مصطفیٰ السباعی، محمد المبارک، مصطفیٰ الزرقاء، خلیل مردم بک، سعید الافغانی، علی الطنطاوی جیسے اہل فکر و قلم حضرات سے استفادہ کا موقع ملا، جو میری زندگی کا ایک سنہرا باب ہے، جس کی مہک و چمک کو آج بھی میری آنکھ اور میری ناک محسوس کرتی ہیں، دمشق میں عرصہ تک قیام رہا لیکن علم کی طلب اور ہوس باقی رہی اور اسی طلب اور ہوس کی بہ دولت مجھے قاہرہ جانے کا شوق پیدا ہوا بلکہ دھن پیدا ہوئی، جب شوق اور دھن دونوں کسی کے دل و دماغ میں پیدا ہو جائیں تو مشکل سے مشکل راہیں ہموار ہو جاتی ہیں بلکہ وہ چیزیں جو خواب ہوتی ہیں حقیقت بن جاتی ہیں، دمشق سے قاہرہ کیسے پہنچا، میرے اندر کیسا شوق تھا، کیا طلب تھی؟ کیا تمنا تھی؟ اس کو میں بیان نہیں کرسکتا لیکن یہ تمنا اور خواہش کیسے پوری ہوئی اس پر مجھے مولانا اسلم جے راج پوری کا ایک شعر یاد آتا ہے:

عزم راسخ ہے نشان قیس وہ شان کوہکن عشق نے آباد کر ڈالے ہیں دشت و کوہسار

شوق اور طلب جب محبت اور عشق میں بدل جاتے ہیں تو مشکلیں پھول بن جاتی ہیں، بہرصورت شام کے چمنستانوں سے جب میں نے وادیٔ نیل میں قدم رکھا تو اس کو وہاں ایک نئی دنیا نظر آئی، قاہرہ آبادی کے لحاظ سے اور رقبہ کے اعتبار سے جتنا پھیلا ہوا ہے اسی قدر وہاں فکر و فن اور زبان و بیان کی شمعیں جلتی ہیں کہ سالک و طالب حیران رہ جائے کہ کہاں جائے اور کہاں رکے، ایسے مواقع پر کسی رہنما کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی رہنمائی سے اعلا سے اعلا چیزیں مل جاتی ہیں، چنانچہ شاید یہی وجہ ہے کہ بزرگوں نے ہمیشہ ہر سالک اور ہر راہ رو سے یہی کہا کہ کسی کو اپنی زندگی میں رہنما بنالو تو زندگی کے پیچ و خم اور دنیا کی بھول بھلیوں میں تم کھونے اور بھٹکنے سے بچ جاؤگے، قاہرہ میں مجھے ایک اعلا درجہ کے مربی کے ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی اور وہ علامہ محمود محمد شاکر کی شخصیت تھی، ان کے گھر سے میں نے بہت کچھ سیکھا، جتنا ان کا اعلا ذوق تھا، اسی اعتبار سے ان کا ذاتی کتب خانہ، جہاں ہر فن کی کتابیں چاہے وہ کسی شکل میں ہوں موجود تھیں، ان ہی کے دولت خانہ پر مجھے یحییٰ حقی سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ ملاقات بھی عجیب و غریب تھی، یحییٰ حقی حکومت کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور بعد میں ترکی اور فرانس کے سفارت خانہ میں بھی اعلا عہدوں پر رہے، جب میرا مصر جانا ہوا اور محمود شاکر صاحب کے

یہاں میری حاضری ہوئی تو معلوم ہوا کہ یحییٰ حقی فرانس سے مصر واپس آچکے ہیں اور ہفتہ میں ایک دو مرتبہ مغرب کے بعد محمود شاکر صاحب کے یہاں تشریف لاتے ہیں، شاکر صاحب یحییٰ حقی سے جتنی محبت کرتے تھے اسی طرح وہ بھی ان کے قدرداں تھے، دونوں کے درمیان اتنی بے تکلفی تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ کون چھوٹا ہے کون بڑا، دونوں ایک دوسرے کی تعریف و توصیف میں لگے رہتے، ایک روز شام میں مغرب بعد یحییٰ حقی صاحب تشریف لائے، چھوٹا قد، گٹھا ہوا جسم، موٹی عینک، سر پر گرم ٹوپی اور لمبا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھے، محمود شاکر صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اور ان کو میرے بارے میں بتایا، وہ مسکرا اٹھے اور یہ جملہ فرمایا: ''أنا سعيد بلقياك يا محمد! أرجو لك النجاح والتوفيق و حسن القيام في بلادنا''
میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور یہ جملہ کہا: ''أنا فخور بأن أكون في مصر و أتمتع بعلمكم وفنكم'' اور پھر میں نے ہنس کر ان سے عرض کیا کہ آج آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہورہا ہے لیکن میں عرصہ سے آپ سے واقف ہوں، وہ ہنس کر بولے کیسے؟ تم تو ابھی مصر میں نئے ہو اور میری تم سے پہلی ملاقات ہے، تم نے مجھے کیسے جانا؟ میں نے عرض کیا کہ عرصہ ہوا میں نے مصر کے ادیب و شاعر اور ناقد سید قطب کی کتاب ''کتب و شخصیات'' پڑھی تھی جس میں انہوں نے آپ کا معرکہ آرا ناول ''قندیل ام ہاشم'' پر بہت ہی عالمانہ اور ادیبانہ تبصرہ فرمایا تھا جس میں آپ کی کتاب کے ساتھ ساتھ آپ کی شخصیت بھی پوری طرح جلوہ گر تھی، میں بہت خوش نصیب ہوں کہ وہ چیز جو خواب تھی آج حقیقت بن گئی ہے اور میں اپنی نظر سے آپ کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہے گا اور میں آپ کے علم و فن سے استفادہ کرتا رہوں گا۔

یحییٰ حقی نے اپنی زندگی کا اہم سفر حکومت میں ملازمت سے شروع کیا، وہ مصر کے مختلف اضلاع میں مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے اور بعد میں ترقی کرکے وزارت خارجہ کے اہم اور اعلا عہدہ تک پہنچے، وہ ترکی اور فرانس میں بھی مصری سفارت خانہ میں اعلا عہدہ پر فائز رہے، عام طور سے حکومت میں ملازمت کے بعد انسان کی بہت سی اعلا صلاحیتیں دب جاتی ہیں اور وہ دفتروں کی فائلوں تک محدود ہو جاتی ہیں لیکن ان ہی لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی

ملازمت کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہوئے زبان وادب اور فکر وثقافت سے وابستہ رہتے ہیں اور یہ وابستگی ان کی زندگی کا اہم مشغلہ ہوتا ہے، خالی اوقات میں ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی علمی و ادبی کتاب ہوتی ہے جس سے وہ اپنے آفس کی تکان کو دور کرتے ہیں اور اپنی فکر وفن کی آماج گاہ کو حسین تر بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، یحییٰ حقی کو افسانہ اور ناول سے بچپن سے لگاؤ تھا، چنانچہ فرانسیسی اور عربی میں جو اہم ناول ان کے زمانہ تک منظر عام پر آچکے تھے، ان کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی اہم زبانوں میں خاص طور سے انگریزی اور روسی زبانوں میں جو اعلا درجہ کے فنی شاہ کار تھے، ان کا بھی انہوں نے بہت شوق اور لگن کے ساتھ مطالعہ کیا، اس طرح فن کی خوبیاں اور اس کی اعلا قدریں ان کی زبان و بیان میں آہستہ آہستہ اس طرح اترتی گئیں کہ آئندہ انہوں نے ان کے سہارے جب اس میدان میں قدم رکھا تو آہستہ آہستہ وہ عرب دنیا کے اہم افسانہ نگار اور ناول نگار مصنفین کی صف میں آگئے، کسی فن میں اعلا مقام حاصل کرنے کے لئے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں لیکن وہ اصول وضوابط آہستہ آہستہ صاحب فن کی فکر وذہن میں دبتے اور ہلکے ہوتے جاتے ہیں، البتہ وہ ذہن وفکر کے اندر اس طرح رچ بس جاتے ہیں کہ جس طرح سے مہک پھول میں سما جاتی ہے، اس طرح فن اور ضوابط کو کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں ایک ساتھ صاحب فن کے قلم میں رواں دواں رہتے ہیں، یحییٰ حقی کا ایک تفصیلی انٹرویو مصر کے ایک موقر رسالہ ''المجلۃ'' میں شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے علمی سفر کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں، انہیں باتوں میں انہیں افسانہ و ناول سے کیسے لگاؤ ہوا اور دنیا کے کن اعلا درجہ کے اصحاب فن سے انہیں دلچسپی پیدا ہوئی اور ان کے اثرات ان کی فکر پر پڑے، ان سب باتوں کا ذکر کیا ہے، اس انٹرویو میں انہوں نے صاف طور پر اس بات کی وضاحت کی کہ انہوں نے سب سے زیادہ روس کے اہل فن سے استفادہ کیا، ان کا کہنا ہے کہ فکر وفن کے لحاظ سے روسی افسانہ وناول کا دنیا کا کوئی ادب مقابلہ نہیں کرسکتا، اس کے بعد انہوں نے انگریزی کے اہم ناول وافسانہ نگاروں کا مطالعہ کیا، روسی زبان سے ان کو بہت واقفیت نہیں تھی لہذا اس کے اہم ناولوں اور افسانوں کے انگریزی تراجم کو انہوں نے پڑھا اور خود انگریزی ادب کے اہم اور اعلا درجہ کے شاہ کاروں کو بھی پڑھا، فرانسیسی ادب سے ان کو خود بڑا

لگاؤ تھا اور اس میں ان کو اعلا درجہ کی صلاحیت حاصل تھی، لہذا فرانس کے مختلف خیال اور مختلف فکر کے ادبا واصحاب فن کا مطالعہ کیا، وہ فطرتاً ادیب تھے اس لئے جس زبان اور جس علاقہ میں ان کو اعلا درجہ کا فن میسر ہوتا ان کا دل و جان سے مطالعہ کرتے اور اس طرح ان کے فکر وفن کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور وہ زبان کی رعنائیوں اور لذتوں سے محظوظ ہوتے رہے، غیر ملکی ادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ وہ عربی زبان وادب کا بھی اعلا ذوق رکھتے تھے، جدید دور کے ادبا میں خاص طور سے جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ، لطفی السید، طٰہٰ حسین اور عقاد سے وہ بہت متاثر تھے اور انہیں ادیبوں کی نگارشات کے ذریعہ وہ قدیم زبان وادب تک پہنچے، قدیم ادیبوں میں جاحظ اور ابن المقفع کے بڑے شیدائی تھے اور نثر نگاری میں ان کو امام کی حیثیت سے دیکھتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ان دونوں ادیبوں کو زبان و بیان پر بڑی قدرت تھی، ان کے یہاں تکلف وتصنع کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا، اسی لئے آج بھی ان کی زبان وبیان زندہ ہے اور ایک جگہ فرمایا جب مجھے کچھ لکھنا ہوتا ہے تو ابن المقفع کی کلیلۃ ودمنۃ کو لے لیتا ہوں اور اس کا مطالعہ شروع کردیتا ہوں، اس کی زبان کی حلاوت اور رعنائی مجھ پر اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے قلم کے اندر جان آگئی ہے اور میرے لکھنے کی صلاحیت بھی ابھر جاتی ہے، اس کے بعد جب میں لکھتا ہوں تو جس انداز میں قلم اٹھاتا ہوں یا جس طرح میری کتاب یا مقالہ کا اٹھان ہوتا ہے اسی طاقت وروانی سے آخر مرحلہ تک میرا قلم پہنچ جاتا ہے اور فکر کی حلاوت کے ساتھ ساتھ میں اپنی زبان کی لذت سے بھی محظوظ ہوتا ہوں، اگر کوئی صحیح معنی میں صاحب فن ہے تو اس کو اپنی تحریروں میں دوسروں کی تحریروں کے مقابلہ میں زیادہ لذت وحلاوت محسوس ہوتی ہے گویا وہ اپنی تحریروں میں اپنی وجدانی کیفیت اور اپنی فکر وفن کی آفاقیت کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور محظوظ ہوتا ہے، گویا یہ یحییٰ حقی کے علمی سفر کی ہلکی سی روئداد یا تصویر ہے جس کو ہم نے ابھی بیان کیا، آیئے اب ہم دیکھیں کہ نقد کے مرحلہ میں انہوں نے کیسے قدم رکھا

انہوں نے خود کو عربی زبان کے اعلا درجہ کے اصحاب فن کی صف میں کھڑا کرلیا تھا، اب ہم دیکھیں کہ تنقید کے میدان میں ان کا کیا معیار رہا اور اس میں انہوں نے کیا مہارت حاصل کی، ناقد اگر صاحب فن ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تنقیدی ذوق بھی اعلا درجہ کا ہے تو

نور علی نور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے کیوں کہ جس چیز کا وہ جائزہ لیتا ہے، اس کے محاسن و معائب دونوں پر اس کی نگاہ تیزی سے پہنچ جاتی ہے اور بڑی آسانی سے وہ ان کی نشان دہی کرتا ہے اور ناقد کا یہی اعلا درجہ کا کمال ہے، وہ تاریکی میں تیر نہیں چلاتا بلکہ وہ روشنی میں اپنی دونوں آنکھوں سے فن کا جائزہ لیتا ہے اور جب وہ کسی فن کے بارے میں اپنی رائے دیتا ہے تو وہ رائے ایسی ہوتی ہے کہ پڑھنے اور سننے والا اس کی حقانیت و صداقت کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن اور تنقیدی ذوق کی بھی کھل کر داد دیتا ہے، تنقید کے میدان میں یحییٰ حقی کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں، پہلی کتاب ''فجر القصۃ المصریۃ'' اور دوسری کتاب ''خطوات فی النقد'' ہے، پہلی کتاب میں مصر میں افسانہ نگاری کی ابتدا اور اس میں تدریجی ارتقا کا عالمانہ اور ناقدانہ تجزیہ کیا ہے اور اس دور کے ناول و افسانہ نگاروں کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی و فکری ارتقا کا جس انداز میں جائزہ لیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یحییٰ حقی کو ان ادیبوں کے مالہ و ماعلیہ کی پوری خبر تھی، ان کی انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک کا ہر پہلو ان کے سامنے ہے، ان کے گھر کا ماحول کیا رہا، کن کن زبانوں سے ان کی واقفیت تھی، دنیا کے کن ادیبوں سے ان کو لگاؤ تھا، کن لوگوں سے استفادہ کیا اور کن کن مرحلوں سے گزرے اور کن کن راہوں سے چل کر ادب و فن کے اعلا مقام تک پہنچے؟ گویا اس دور کے اعلا درجہ کے شاہ کاروں سے واقفیت کے ساتھ ساتھ ان کے قدم کے نشانات کی بھی ان کو پوری خبر ہے، اس طرح جدید دور کے نقادوں میں یحییٰ حقی کا کوئی ثانی نہیں۔

یحییٰ حقی جیسا کہ خود انہوں نے اپنی معرکہ آرا کتاب ''خطوات فی النقد'' میں ایک جگہ فرمایا ہے کہ میں کبھی بھی فیکلٹی آف آرٹس کا طالب علم نہیں تھا اور نہ میں نے تنقید کے جو مختلف مذاہب ہیں، ان کا مطالعہ کیا ہے، اس لئے میں کسی خاص تنقیدی اسکول سے کبھی وابستہ نہیں رہا لیکن ادب و فن کے جو اعلا درجہ کے شاہ کار ہیں ان کا میں نے گہرا مطالعہ کیا ہے اور مطالعہ کے دوران مجھے فنی خوبیاں بلکہ یوں کہوں کہ جگنو کی طرح چمکتی ہوئی سطروں میں جو چمک اور رونق نظر آتی تھی ان سے میں محظوظ ضرور ہوتا بلکہ یوں کہوں کہ وہ میری نظروں میں ٹھہر جاتی تھی، کسی اعلا فن کے اعلا مقام تک پہنچنے کے لئے کون سے ذرائع و وسائل ہونے چاہییں ان کی تعیین تو بڑی مشکل ہے کیوں کہ فن کی اعلا قدریں نحو و صرف کے قواعد اور ریاضیات کے اصول و ضوابط سے

بالکل مختلف ہوتی ہیں، صاحب فن کا ذہن جتنا کھلا ہو، اس کا ضمیر جتنا روشن ہو، اس کے لہو میں جتنی حرارت ہو اسی کے اعتبار سے وہ آگے کی طرف بڑھتا ہے، کیوں کہ الفاظ ہی زبان کی عظمت کے لئے پہلا مرحلہ ہوتے ہیں اور اچھے الفاظ کے انتخاب سے ترکیبیں خود بہ خود ڈھلتی ہیں، اس وقت ایسا لگتا ہے کہ ایک فکر سے دوسری فکر کی طرف اس کا ذہن بڑھتا ہے تو طاقت ور الفاظ اور مربوط ترکیبوں کے ذریعہ ہر سطر کے بعد الفاظ کے ساتھ ساتھ نئی فکر بھی ڈھل جاتی ہے، اس طرح ربط و تسلسل کا یہ سلسلہ شروع سے لے کر آخر تک جاری و ساری رہتا ہے اور پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ ہر سطر میں اس کو ایک نئی فکر اور نئی فکر کے ساتھ حسین و جمیل الفاظ و جملوں سے اس کا دامن بھر جاتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ آنکھ سے لے کر اس کے وجدان تک دونوں یکساں طور پر محظوظ ہوتے ہیں اور درحقیقت یہی اعلا فن کی علامت ہے۔

تو گویا یحییٰ حقی کے کہنے کے مطابق ناقد کا اپنا خود وجدان ہوتا ہے، اس کا احساس ہوتا ہے، الفاظ و تراکیب کی الگ پہچان ہوتی ہے جس کی بہ دولت وہ فن کے محاسن و معائب دونوں کا اظہار کر دیتا ہے، گویا منہجی تنقید سے بالاتر ہو کر خود اس کا اپنا اعلا درجہ کا مطالعہ اور فن سے اعلا درجہ کا لگاؤ اور اس کے قد و قامت پر اس کی گرفت ہوتی ہے جو بعد میں درحقیقت تنقید کا اعلا نمونہ بن جاتے ہیں، بلکہ تنقید کے طالب علموں کے لئے صحیح معنی میں رہنما ثابت ہوتے ہیں، یحییٰ حقی کے کہنے کے مطابق ناقد کبھی مقلد نہیں ہوتا، تنقیدی عمل بھی درحقیقت ایک طرح کا ایجادی عمل ہے اور ناقد اگر صاحب فن بھی ہے تو اس کے تنقیدی اشارے تنقید کے طالب علموں کے ساتھ ساتھ تحقیق کے جو اشخاص ہوتے ہیں، ان کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور درحقیقت یہی اعلا درجہ کا نقد ہے جو سب کی رہنمائی کرتا ہے، یحییٰ حقی نے اپنے تنقیدی مقالات میں اسی لحاظ سے تجزیہ کیا ہے اور ان کے تجزیاتی مقالوں میں فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ صاحب فن کی ذہنی و فکری تربیت بھی سامنے آ جاتی ہے، اس لحاظ سے یحییٰ حقی کا موجودہ دور میں کوئی ہم سر و ثانی نہیں، مثال کے طور پر ہم اس دور کے دو اہم اصحاب فن ہیکل اور احمد تیمور کے ذہنی و فکری ارتقا کو جس کا تجزیہ یحییٰ حقی نے اپنے خاص انداز میں کیا ہے، پیش کرتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں ہیکل نے ''زینب'' لکھی اور اس زمانہ میں لکھی جب افسانہ کے لئے کہیں

بھی زمین ہموار نہیں تھی اور افسانہ نگاری اس وقت تک بالکل ابتدائی مرحلہ میں تھی بلکہ مشرق میں جو افسانہ نگاری تھی، اسی کی مختلف شکلیں مختلف افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتی تھیں لیکن جدید دور کی افسانہ نگاری سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، جدید دور سے مراد وہ افسانہ نگاری ہے جو مغرب کی افسانہ نگاری سے ماخوذ ہے، ہیکل قانون کے طالب علم تھے، انگریزی زبان پر ان کو قدرت تھی، ان کے والد ان کی تعلیم کے لئے پریشان تھے، انہوں نے لطفی السید جو اپنے زمانہ کے فکر وفن کے امام مانے جاتے تھے ان سے مشورہ کیا، ان کی رائے ہوئی کہ ہیکل کو فرانس بھیجا جائے جہاں وہ قانون کی اعلا تعلیم حاصل کریں، ہیکل اور ان کے والد کو لطفی السید کی بات ماننی ہی تھی، چنانچہ استاذ الجیل کے مشورہ کے مطابق وہ فرانس گئے اور قانون کے طالب علم کی حیثیت سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا کام شروع کیا، وہاں انہوں نے فرانسیسی زبان سیکھی اور محنت کر کے چند دنوں میں اس میں عبور حاصل کر لیا، فرانسیسی ادب کے مطالعہ سے انہیں نئی نئی راہوں کا اندازہ ہوا اور قانون کی کتابوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے فرانسیسی ادب کا بھی گہرا مطالعہ، افسانہ، ناول اور ڈرامہ کے ذریعہ سے شروع کیا اور اس طرح آگے بڑھنے کی زندگی کی مختلف راہیں کھلیں اور فن و اہل فن سے واقفیت پیدا ہوئی، فرانسیسی زبان میں جو ناول و افسانے انہوں نے پڑھے ان میں خاص طور پر وہ ناول جن میں فرانسیسی قومیت و وطنیت کی جھلک ملتی تھی، ان میں ان کو لذت محسوس ہونے لگی اور وطنیت و قومیت کی جو طلب یا اس کا سوز و ساز ان کے دل میں پیدا ہوا تو ان کے سامنے ان کا ملک مصر آ گیا، وہ مصر کے ہر طرح کے طبقہ سے واقف تھے جس علاقہ کے رہنے والے تھے وہاں کے لوگوں سے ان کو واقفیت و لگاؤ تھا کیوں کہ ان کے والد بڑے زمین داروں یا جاگیرداروں میں تھے، وہ دیہات و قصبات اور گاؤں کی زندگی سے واقف تھے، مصر کے کسانوں کی غربت، بدحالی، مفلسی اور جہالت ان کے سامنے تھی اور اس کے ساتھ ساتھ مصر کی زرخیزی، دریائے نیل کی عظمت و فیضان، وہاں کے لوگوں کی دریائے نیل سے محبت اور گاؤں سے الفت کا بھی انہوں نے عینی مشاہدہ کیا تھا، اس طرح عربی زبان کا پہلا ناول ''زینب'' جس کو ہیکل نے فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے دوران قیام مرتب کیا تھا، ان کا جسم تو دیار غرب میں تھا لیکن ان کا قلب و وجدان مصر میں تھا، وہاں کے کسان، سرزمین، دریائے نیل کا فیضان، سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت جو

انہیں حسن نظر آتا تھا، اس کی تصویر انہوں نے زینب میں پیش کی ہے، گویا زینب کی ترتیب میں ہیکل کا قلم، ان کا وجدان، ان کا احساس اور ان کا ذہن پوری طرح سے جلوہ گر تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ جدید افسانہ نگاری کے جو اصول و ضوابط ہو سکتے تھے ان کو بھی ہیکل نے پوری طرح اپنایا تھا، اس طرح یہ ناول فکر و فن، زبان و بیان، تصویر و تعبیر کے لحاظ سے منظر عام پر آیا اور ہیکل ایک صاحب فن کی حیثیت سے مصر ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے عرب میں معروف و مشہور ہو گئے۔

ہیکل اعلا خاندان کے ایک فرزند تھے جن کا علاقہ میں عزت و احترام تھا اور اس زمانہ میں افسانہ نگاری اعلا خاندان کے فرزندوں کے شایان شان نہیں تصور کی جاتی تھی، چنانچہ ہیکل نے زینب چھپنے کے بعد اس میں اپنا نام نہیں لکھا کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ لوگوں کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئے گی کہ اعلا خاندان کا ایک فرزند ایسے کام سے وابستہ ہو جس کو کم درجہ کے خاندان کے نوجوان اپناتے ہیں اور اس کو اپنی روزی روٹی کا ذریعہ بناتے ہیں، اس لئے ہیکل نے زینب میں اپنے نام کو چھپایا، زینب کے سلسلہ میں جو خوبیاں اور اعلا درجہ کی صلاحیت یحییٰ حقی کو نظر آئی ان کی دل کھول کر داد دی ہے اور کہیں اگر کوئی کمی محسوس ہوئی تو اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد وہ محمد تیمور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کے اور ان کے خاندان کے بارے میں بہ تفصیل بیان کرتے ہوئے محمد تیمور کی شخصیت کی طرف قدم رکھتے ہیں اور ہیکل سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہیکل اور محمد تیمور کے درمیان بہت سی چیزیں مشترک ہیں، دونوں اعلا درجہ کے خاندان میں پیدا ہوئے اور دولت و عزت ان کے خاندان میں تھی، دونوں کو مصر سے لے کر فرانس تک اعلا درجہ کی تعلیم حاصل کرنے کے مواقع ملے، دونوں کو عربی زبان سے لے کر فرانسیسی زبان تک اعلا درجہ کی قدرت حاصل تھی، دونوں کو اعلا درجہ کے مفکروں اور ادبا کی سرپرستی حاصل تھی، ہیکل کے صحیح معنی میں مربی و سرپرست لطفی السید تھے اور تیمور کے سرپرست اور مربی ان کے والد احمد تیمور تھے، محمد تیمور نے شان و شوکت اور عزت کی تمام شکلیں اپنے گھر میں دیکھی تھیں، احمد تیمور جتنے اعلا درجہ کے ادیب اور عالم تھے، اتنے ہی علم دوست تھے، ان کا گھر ایک بڑا محل تھا جس میں

ہر شام مصر کے ادیبوں، شاعروں، سیاست دانوں، سماجی خدمت گاروں اور علما کا اجتماع ہوتا تھا اور اس محل کی شان و شوکت کے اعتبار سے آنے والوں کی خاطر بھی ہوتی تھی، یہ خاندان جتنا اعلا درجہ کا تھا اتنا ہی علم نواز تھا، چنانچہ محمد تیمور نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں علم و ادب اور فکر و فن کا چرچا رہتا تھا، وہیں سے ان کا ادبی ذوق نکھرنے لگا، وہ شروع ہی سے زبان و ادب اور فکر و فن کے شیدائی تھے، افسانہ، ناول اور ڈرامہ سے ان کو غیر معمولی لگاؤ تھا اور ایسا لگتا تھا کہ افسانہ، ناول اور ڈرامہ کے لئے وہ مچل رہے ہیں، ان کے رگ و ریشہ میں ان کی طلب بلکہ تڑپ ہے اور انہوں نے زندگی کے ابتدائی مرحلہ ہی سے ادب و فن کی شاہ راہ پر خود کو ڈال دیا اور تیزی سے آگے بڑھتے رہے، ایک طرف ان کو خاندان کی عزت و وقار اور عظمت کا خیال تھا تو دوسری طرف اپنی فکر و فن کی طلب کو بڑھانا ہی تھا گھٹانا نہیں تھا، بلکہ یوں کہا جائے کہ ان کو آگے ہی بڑھتے رہنا تھا پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھنا تھا، گویا ادب و فن ان کی زندگی کا جزلاینفک تھا، اس کی حلاوتوں و لذتوں سے وہ سرشار تھے، اس کے برخلاف ہیکل اگرچہ اعلا خاندان میں پیدا ہوئے، ہر طرف دولت و ثروت کی فراوانی تھی، ان کے خاندان کی عظمت کا ہر طرف چرچا تھا لیکن ان کی ابتدائی زندگی علم کی شاہ راہوں سے آگے بڑھ رہی تھی، انہوں نے جدید و قدیم زبانوں کا گہرا مطالعہ کیا، اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی، وہ قانون کے طالب علم تھے، اس لئے اسلامی قانون کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا، گویا ان کی زندگی کی اٹھان علم و عرفان، زبان و بیان اور تاریخ و ثقافت سے شروع ہوئی، ان کے یہاں فن کی وہ بے چینی اور بے تابی نہیں تھی جو تیمور کے یہاں تھی، اگرچہ ان کا ناول زینب عربی زبان کی ناول نگاری کے میدان میں سب سے اہم اور اعلا درجہ کا ناول ہے لیکن اس کو انہوں نے اس وقت لکھا جب علم کے میدان میں وہ بہت آگے نکل چکے تھے، اس لئے جب انہوں نے اپنا یہ شان دار معرکہ آرا ناول لکھا تو ناول نگار کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آنے میں انہیں شرم محسوس ہوئی یا انہیں اپنے خاندان کے وقار کی لاج بھی رکھنی تھی اس لئے ناول پر اپنا نام لکھنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔

یحیٰ حقی کا خیال ہے بلکہ اس کو انہوں نے ادیبانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ زینب کا مطالعہ اور ہیکل کی زندگی کا جب میں جائزہ لیتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہیکل ایک

بہت بڑے عالم، مفکر اور محقق اسکالر ہیں، ازہر کے علما کے طرز زندگی سے وابستہ ہیں، ان کے سر پر عمامہ اور جسم پر لمبا کرتا اور عبا ہے جس سے دنیاوی اور دینی وقار کا مظاہرہ ہوتا ہے، ہیکل نے اچانک اپنی روش بدلی، عمامہ کے بجائے ترکی ٹوپی، لمبے کرتے اور عبا کے بجائے مغربی طرز کا سوٹ زیب تن کر کے لوگوں کے سامنے آئے، ایک طرف ماضی قریب کی زندگی اور حال کی اچانک تبدیلی سے ان کے اندر ہلکی ہلکی شرمندگی کا احساس ہے اور یہ عام طور سے ہوتا ہے، جب انسان ایک شکل سے دوسری شکل اختیار کرتا ہے یا ایک طرز زندگی سے نکل کر دوسرا طرز زندگی اپناتا ہے تو اس کے اندر کبھی احساس کم تری نظر آتا ہے اور کبھی احساس شرمندگی، یہ چیز ہم ہیکل کے یہاں محسوس کرتے ہیں، اس کے برعکس احمد تیمور کے یہاں ماضی و حال میں کبھی تضاد نہیں تھا، اس لئے ان کے اندر احساس کم تری کے بجائے احساس برتری ہمیشہ رہا اور فکر و فن میں کامیابی سے وہ خوش اور مطمئن تھے۔

افسانہ و ناول کے میدان میں وہ اپنا قدم جماتے رہے اور کم عمری ہی میں اعلا درجہ کے اہل فن میں شامل ہو گئے، فکر کی گہرائی کے ساتھ ساتھ الفاظ پر ان کو ایسی قدرت تھی کہ ایسا لگتا ہے کہ ہر فکر الفاظ میں اس طرح سما جاتی ہے کہ جیسے خون کی حرارت رگوں میں جب پہنچتی ہے تو اس کی گرمی انسان کے خد و خال میں نظر آنے لگتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ و معنی میں ایسا تناسب پیدا ہو جاتا ہے کہ جس سے فکر کی رعنائی کے ساتھ ساتھ زبان کی جادو آفرینی بھی کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، اس میں صاحب فن کی اپنی ذاتی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اس کا اعلا درجہ کا فطری ذوق بلکہ کبھی کبھی الہامی شکلیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں، جو سب کے نصیب میں نہیں ہوتیں، احمد تیمور نے کم عمر پائی تھی اور ان کا ستارہ پوری طرح سے چمکنے بھی نہ پایا تھا کہ بجھ گیا لیکن تیموری خاندان کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی محمود تیمور نے جو شمع بجھنے جا رہی تھی اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے بھائی کے نقش قدم پر اسی تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے، خدا نے ان کو طویل عمر عطا فرمائی اور اسی کی وجہ سے انہوں نے افسانہ و ناول کو اعلا مقام تک پہنچایا، یحیٰ حقی لکھتے ہیں کہ ان کے ناولوں میں مصر کی شخصیت، مصر کا مزاج اور زبان کا بلند معیار ملتا ہے، یہاں تک کہ مستشرقین نے ان کے ناولوں کو پسند کیا اور مغربی زبانوں میں ان کے ترجمے کئے جس کی

وجہ سے ان کا نام یورپ میں پہنچا اور لوگوں نے مصر کی عظمت کو ان کے ناولوں کی روشنی میں دیکھا، اللہ کا شکر ہے کہ محمود تیمور آج بھی زندہ ہیں اور اسی لو اور لگن کے ساتھ ادب وفن کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ادب کی خدمت ان کی زندگی کا عزیز تر مشغلہ ہے۔

اسی طرح ہلکے انداز میں یحییٰ حقی نے تیموری خاندان اور ہیکل کے خاندان کا جائزہ لیا ہے اور دونوں نے اپنی اپنی حیثیت اور مزاج کے مطابق علم وفن کی جو خدمت کی ہے اس کا عالمانہ اور ناقدانہ انداز میں بیان کیا ہے، اس کے بعد ہم مصر کے دوسرے ناول نگاروں کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کے بارے میں یحییٰ حقی نے مختلف مواقع پر اظہار خیال کیا ہے۔

یحییٰ حقی نے فجر القصۃ المصریۃ میں مصر کے ہر مزاج وصلاحیت کے لوگوں کا جس انداز میں ذکر کیا ہے اس میں ان کی شخصیت مسکراتی ہوئی اور کبھی طنز کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جہاں ان کی مسکراہٹ میں غیر معمولی حلاوت ہوتی ہے وہیں ان کے طنز میں اسی طرح تلخی بھی ہوتی ہے اور ان کا طنزیہ انداز پڑھنے والوں کو بہت ہی بھلا لگتا ہے کیوں کہ جن موقعوں پر وہ طنز کرتے ہیں ایسا لگتا ہے کہ طنز بالکل صحیح اور برمحل ہے، یہی ناقد کی کامیابی کی سب سے بڑی علامت اور فن پر قدرت کی اعلا درجہ کی دلیل ہے، مصر کے مشہور ناول نگار عیسی عبید کے ناولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

عیسی عبید نے جدید مصری ناول نگاری میں غیر معمولی مہارت دکھائی اور ان کو مصر اور مصر کی شخصیت سے غیر معمولی لگاؤ اور محبت ہے، اپنے ناولوں اور افسانوں میں وہ مصر کی شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ ان کو مصر سے غیر معمولی لگاؤ اور مصری عوام سے غیر معمولی محبت ہے، عیسی عبید نے جو ان کا مختلف ناولوں کا مجموعہ ہے ان پر ایک تفصیلی مقدمہ لکھا ہے، اس مقدمہ میں انہوں نے تفصیل سے ناول کے اصول وضوابط اور زبان وبیان کے مسائل کو بہت ہی عالمانہ اور ناقدانہ انداز میں بیان کیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ یہ مقدمہ مصر ہی کے ناول نگاروں کے لئے نہیں بلکہ عالمی اصحاب فن کے لئے لائحۂ عمل بن سکتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ ناول نگار کم اور ناقد زیادہ ہیں، یہاں ہم اس اختصار کو ذکر کرتے ہیں جہاں یحییٰ حقی نے مقدمہ کی چند سطریں پیش کی ہیں:

"فغايتنا الوحيدة من تأليف القصص أن نساعد على ايجاد أدب مصري عصري خاص بنا و مرسوم بطابع شخصيتنا و أخلاقنا يتفق مع ما بلغناه من الرقي و النضوج المبكر البدري"۔

اس مقدمہ کے حوالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ عیسی عبید نے کس عالمانہ انداز میں افسانہ کے مبادی واصول کا تجزیہ کیا ہے اور ان مشکلات ومسائل کا بھی ذکر کیا ہے جن سے مصری افسانہ نگار دوچار ہیں اور ان مسائل کے حل کے جو مختلف طریقے اور ذرائع ہیں، ان کا بھی ذکر کیا ہے، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اس مقدمہ کو ہم ایک طرف پڑھتے ہیں اور دوسری طرف ان کی ناولوں کو دیکھتے ہیں تو دونوں میں کہیں اتحاد واتفاق نظر نہیں آتا، بلکہ وہ اصول و ضوابط جو انہوں نے اپنے مقدمہ میں ذکر کئے انہیں سے ان کے ناولوں پر ضرب لگتی ہے، ایسا لگتا کہ انہوں نے جو اصول وضوابط مرتب کئے انہیں کو سامنے رکھ کر وہ ناول لکھتے ہیں اور ایسا لگتا کہ وہ بچے جو قواعد وگرامر پڑھتے ہیں اور اسی گرامر کی روشنی میں وہ جملوں کی مشق وتمرین کرتے ہیں، ظاہر ہے، جس فن میں تطبیقی مزاج اور تطبیقی صورت حال ہو اس کے اندر روانی اور شگفتگی بلکہ جولانی اور فکر کی وسعت کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور فن لڑکھڑاتا ہوا نظر آئے گا، یحییٰ حقی کا یہی مزاج ان کے ہر تنقیدی عمل میں نظر آتا ہے اور جہاں وہ شخصیات اور فن کا جائزہ لیتے ہیں ان کے اندر مروت اور مصلحت پسندی بالکل قریب نہیں آنے پاتی بلکہ تعریف وتوصیف کے ساتھ ساتھ ضرب کاری بھی ان کا فلسفہ ہے، آیئے اس کے بعد ہم جدید دور کے سب سے کامیاب اور عالمی شہرت پانے والے افسانہ وڈرامہ نگار توفیق الحکیم کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں یحییٰ حقی نے جو باتیں کہی ہیں ان کو پڑھیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ یحییٰ حقی کو فن تنقید میں جو غیر معمولی مہارت ہے اس کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کے جو اعلا مراحل ہیں وہاں تک ان کی پرواز کیسی ہے، جس انداز میں انہوں نے توفیق الحکیم کی تعریف وتوصیف کی ہے یا یوں کہیے اپنے مقالہ کی شروعات انہوں نے جس طرح کی ہے توفیق الحکیم کی ہر بات کو وہ کس محبت واخلاص سے پیش کرتے ہیں اور ان کی تعریف وتوصیف میں ان کا قلم کس طرح مچلتا ہے اور زبان کی مہارت کے ساتھ ساتھ اس میں محبت واخلاص کی بھی چمک محسوس ہوتی ہے، آیئے چند سطور کو ہم یہاں نقل کریں، اس کے بعد ہم

دوسری چیزوں کی طرف قدم بڑھائیں گے، وہ لکھتے ہیں:

"انتهى فجر القصه بظهور توفيق الحكيم، انه من معدن لا تجود به الأقدار الا ببخل و عن وعى، هى فى بعض الأحيان ذات نزوات هيهات أن تجد لها تفسيراً أو تعرف دوافعها و مراميها، فاذا هى تزوغ من قوانين الوراثة و البيئة و أحكام المنطق و مقاييس التفاضل، و تختار من بين آلاف الأشياء و النظائر انسانا قد يكون غمرا ...... فيه قبس العبقرية فيضى، بنور و هاج، هو نفسه لا يدرى لماذا وقع عليه الاختيار بل يحس أن منبع هذا الفيض الذى يتدفق فى هدير العيون النضاحة ليس هو نفسه، بل قوى خفية تلبسته، وما يحسبه الناس مشقة ونصباً انما هو اليسر بعينه فما هو الا الهام - و يخيل اليك انه غير مرتبط بزمان و مكان، ولكن هذه الاقدار تعمل كذلك بحكمة و منطق و وعى حين تصطفى لزمان و مكان من أصحاب المواهب من تكل اليه القيام بدور يميزه عن غيره، و يتيح له بقاء الذكر حين تريد أن ترمز به وهى ترسم الطريق الى انتهاء عهد و بداية عهد آخر ...."۔

اس سلسلہ میں یحییٰ حقی دیگر اور منظر پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے اپنی فکر کی وسعت اور فن کی مہارت اور زبان کی لطافت پیش کی ہے:

"وكانت القصص الأولى لتوفيق الحكيم مؤذنة بانتهاء عهد الهواية و الاقتباس و الشكوك و ابتداء، وهذا ارتفاع القصة من مجال الوجدان وحده الى مجال الوجدان و الفكر معاً، ومن السطحية الى العمق، ومن الرجل الى الانسان، ومن الوطن الى العالم. وتحوله الأسلوب من الشكل الى الجوهر، جماله مستمد من نصاعة الفكرة وحذها ......"۔

یحییٰ حقی نے یہ سطور تقریباً ۱۹۶۰ء میں لکھی ہیں، یعنی جس سال یہ کتاب فجر القصة منظر عام پر آئی، یہ وہ زمانہ ہے جس میں توفیق الحکیم کے اکثر و بیشتر ناول اور ڈرامے منظر عام پر آ چکے تھے

اور وہ عرب میں سب سے بڑے ناول و ڈرامہ نگار کی حیثیت سے جانے جا چکے تھے اور ان کی فنی خوبیاں ہر اعتبار سے عوام و خواص میں پورے طریقہ سے مقبول ہو چکی تھیں، چنانچہ اس کی روشنی میں یحییٰ حقی نے توفیق الحکیم کی اس انداز میں تعریف و توصیف کی ہے اور اپنی تحریروں سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی ناول اور ڈرامہ نے توفیق الحکیم کے قلم سے ہی صحیح راہ پائی ہے، یہاں یہ بات ذکر کرنا نامناسب نہیں ہوگا کہ یحییٰ حقی نے ۱۹۳۴ء میں ایک مضمون توفیق الحکیم کے دو ناولوں "عودة الروح" اور "اصحاب الکہف" پر اپنے دوست سامی الکیالی کی فرمائش پر لکھا تھا اور ان کا یہ مضمون حلب کے مشہور رسالہ "الحدیث" میں شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر سامی الکیالی تھے، اس وقت یحییٰ حقی مصر کے سفارت خانہ استنبول میں کسی اچھے عہدہ پر فائز تھے، سفارت خانہ کے کاموں کے ساتھ ان کا ادبی اور علمی ذوق مدھم نہیں ہوا تھا بلکہ عالمی ادب پر اپنے مطالعہ کو انہوں نے جاری رکھا تھا، اس سے یحییٰ حقی کے علمی ذوق اور فنی لگن کا اندازہ ہوتا ہے، یحییٰ حقی نے اپنے اس مقالہ کے کچھ حصہ کو اپنی اس کتاب میں بھی شامل کر دیا ہے اور شامل کرنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اس طویل عرصہ میں توفیق الحکیم نے تدریجاً کتنی ترقی کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دکھانا ہے کہ پچیس سال پہلے ان کی جوانی کا زمانہ تھا، اس وقت تنقید اور فن پر ان کو کتنا کمال حاصل تھا، یقیناً فجر القصة المصریة جو ۱۹۶۰ء میں چھپی تھی اور وہ مقالہ ۱۹۳۴ء میں چھپا تھا، گویا پچیس کا عرصہ علمی لحاظ سے بہت طویل عرصہ تصور کیا جاتا ہے اور ۱۹۳۴ء میں یقیناً یحییٰ حقی کی جوانی کا زمانہ تھا، جوانی کے دور میں انسان کے جذبات اور فنی احساسات، زبان و بیان کے نشیب و فراز کا پورا احاطہ نہیں کر پاتے، اس کے باوجود یحییٰ حقی نے یہ مقالہ اپنی کتاب میں شامل کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پچیس سال پہلے ان دونوں کتابوں کے بارے میں ان کی جو رائے تھی یا جو تبصرہ تھا اس میں انہوں نے کوئی ترمیم نہیں کی ہے، یحییٰ حقی نے ان دونوں کتابوں پر کھل کر تبصرہ کیا ہے اور زبان کے ساتھ اس میں جو فنی خامیاں ہیں ان کو بھی پورے طریقہ سے اجاگر کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ان دونوں کتابوں کے بارے میں عرب نقادوں کی الگ الگ رائیں تھیں، کچھ ادیبوں نے ان کتابوں کو عالمی ادب کی صف میں شامل کیا اور کچھ نے ان کو یہاں تک کم تر دکھایا کہ کاش یہ منظر عام پر نہ آتیں۔

گویا دونوں گروہوں کے درمیان افراتفری کا عالم تھا، یحییٰ حقی نے بہت ہی سنجیدہ انداز

میں ان دونوں کتابوں پر تبصرہ کیا اور ان میں جو خامیاں تھیں ان کو پیش کرنے میں ذرا بھی مروت
سے کام نہیں لیا بلکہ جس انداز میں انہوں نے تبصرہ کیا یقین نہیں ہوتا کہ یحیٰ حقی پچیس سال پہلے
بھی زبان و بیان پر مہارت کے ساتھ ساتھ فن کے نشیب و فراز سے پوری طرح واقف تھے اور
جس انداز میں انہوں نے توفیق الحکیم کی فنی گرفت کی ہے، ایک اعلا درجہ کا صاحب فن اور ناقد ہی
کرسکتا ہے، چنانچہ انہوں نے طنزیہ انداز میں اپنے مقالہ کو کتاب میں شامل کرتے ہوئے لکھا ہے
کہ جب میں اس مقالہ کو پڑھتا ہوں تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور خوشی بھی ہوتی ہے، اگرچہ ان دونوں
کتابوں کی عرب دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی اور آج بھی ہو رہی ہے لیکن یحیٰ حقی نے جن خامیوں
اور کمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے آج بھی ان پر زیادہ تر ادیبوں اور ناقدوں کا اتفاق ہے، سب سے
پہلے یحیٰ حقی نے جو تنقید کی ہے وہ یہ کہ توفیق الحکیم نے مکالمہ یا حوار کے لئے جن ہیروؤں کا انتخاب
کیا ہے وہ نہ مصری ہیں اور نہ مصری زبان و ثقافت سے ان کو کوئی دل چسپی ہے اور یہ مضحکہ خیز بات
ہے، دوسرے ''اصحاب الکہف'' میں انہوں نے مصریوں سے اس بات کی درخواست کی ہے کہ وہ
جہاد و قربانی اور جوش و خروش کے بجائے صلح کن رویہ کو اپنائیں اور یہ وہ دور ہے جب پوری مصری
قوم سامراجی طاقتوں کے ظلم و زیادتی کا شکار تھی اور جہالت و غربت کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی،
اس دور میں عوام کے جذبات کو دبانا اور ان کو جہاد و قربانی کے راستہ سے ہٹانا کوئی معنی نہیں رکھتے،
صلح اور آشتی کا راستہ ان قوموں کو دکھایا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے اور دوسروں کو
نیست و نابود کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، دفاع کے عمدہ سے عمدہ ہتھیار ان کے پاس موجود ہوتے
ہیں، اگر ان سے صلح و امن کی درخواست کی جائے تو اس کے کچھ معنی ہوتے ہیں اور ڈوبتی ہوئی قوم
کو جو ساحل سے بہت دور ہے اس سے صلح و امن کی بات کرنا ناسمجھی اور حماقت کے علاوہ اور کیا ہو
سکتا ہے، کیا مصر کے لوگ آج اس حالت میں ہیں کہ ان سے اس طرح کی بات کی جائے۔

یحیٰ حقی نے ان دونوں کتابوں پر علمی اور فنی دونوں لحاظ سے عالمانہ و ناقدانہ انداز میں گفتگو
کی ہے اور اس مقالہ سے فن تنقید اور فن تبصرہ میں جو ارتقا ہوا ہے، اس کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یحیٰ حقی نئے دور کے ان لوگوں میں ہیں جنہوں نے صاحب فن کی حیثیت سے بھی
عالم فکر میں ایک مقام حاصل کیا اور تنقید کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا، نئے دور کے ناقدوں

میں جنہیں فنی مہارت کے ساتھ ساتھ فن تنقید میں بھی شہرت حاصل ہوئی، ان میں چند ہی ہیں،
عباس محمود العقاد جنہوں نے افسانہ و ناولوں پر تبصرہ کیا ہے، عبدالقادر المازنی جو ناول نگار بھی تھے
اور ناقد بھی تھے اور میخائیل نعیمہ جن میں بہت تنوع تھا اور دنیا کی کئی زبانوں پر قدرت و مہارت
حاصل تھی، اس لئے ان کے تنقیدی نظریات کو عرب میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اگر ہم
یحیٰ حقی کا موازنہ ان لوگوں سے کرتے ہیں تو یحیٰ حقی کو ان لوگوں پر اس لحاظ سے تفوق حاصل
ہے کہ انہوں نے زندگی کے مرکز و محور کو ایک صاحب فن کی حیثیت سے گزارنے کی کوشش کی اور
عرب دنیا میں جو فنی چیزیں منظر عام پر آرہی تھیں ان پر انہوں نے تنقیدیں کیں اور تبصرے کئے،
ان کے ایک ایک لفظ سے یحیٰ حقی کے فنی نشاط و شعور اور تنقید کے اعلا معیار کا پتا چلتا ہے، یحیٰ حقی
ہر فن میں دو چیزوں پر زور دیتے ہیں، زبان و بیان کی نزاکت و نفاست اور فکر و احساس کی وسعت
جس میں صاحب فن کی شخصیت اوجھل نہ ہو، بلکہ ایک ایک لفظ سے اس کی شخصیت سامنے آتی
ہے گویا اسلوب کی ندرت اور فکر کی وسعت یحیٰ حقی کے تنقیدی شعور کا نچوڑ ہے اور وہ اسی کے
داعی و مبلغ تھے، ان کے نزدیک تحریر و تعبیر میں گہرا ربط ہوتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ دونوں ایک
دوسرے کے معاون و محرک ہوتے ہیں جس طرح سمندر کی موجیں ایک دوسرے سے اس قدر
مربوط ہوتی ہیں کہ اگر ایک موج بھی کم زور ہوجائے تو اگلی موج بالکل بے سہارا ہوجاتی ہے، گویا
تحریر و تعبیر سے ادب میں حرکت و حرارت پیدا ہوتی ہے، اگر یہ دونوں عناصر ادب میں مفقود
ہوجائیں تو ان کی جگہ تقلید و تحمیق لے لیتی ہے، جہاں ادب بالکل بے وقعت اور بے معنی ہوجاتا
ہے، چنانچہ انہوں نے بہت سے لوگوں کی زبان و اسٹائل پر سخت گرفت کی ہے، طاہر لاشین کے
ناول ''سخرية النائی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''طاہر لاشین نے اپنے ناول میں
خطیبانہ انداز اختیار کیا ہے حالاں کہ ناول نگار بڑی خاموشی سے اپنا کام کرتا ہوا گزر جاتا ہے اور
پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس سے مخاطب ہے، گویا ان میں سے ہر ایک دوسرے سے کانا
پھوسی کر رہا ہے، کیا کبھی کسی نے دو کانا پھوسی کرنے والوں کو بلند آواز کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا
ہے؟ یہ مسخرہ پن نہیں تو اور کیا ہے؟''، اسی طرح عزیز اباظہ کے ڈرامہ ''مسرحية شهريار
الشعرية'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''عزیز اباظہ نے بڑی جاں فشانی اور عرق ریزی

سے اس شعری ڈرامہ میں حسین اور نادر الفاظ کا استعمال کیا ہے جس کو وہ اپنے لئے فتح مبین تصور کرتے ہیں، اگر کوئی عزیز اباظہ سے یہ پوچھے کہ افسانہ اور ڈرامہ کی زبان عام فہم ہونی چاہیے یا ان کو غیر مانوس اور نادر الفاظ کا مجموعہ بنا دیا جائے، درحقیقت ان کا یہ شعری ڈرامہ ڈرامہ نہیں بلکہ نادر اور حسین الفاظ کا مجموعہ ہے جس کو ہم نادر الفاظ کی ڈکشنری (قاموس) قرار دے سکتے ہیں، کاش وہ اس طرح کے الفاظ سے بچنے کی کوشش کرتے تو ان کا یہ ناول زیادہ کامیاب اور وقیع ہوسکتا تھا''، اسی طرح سعید العریان کے ناول ''بنت قسطنطين ''پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ تاریخی ناول بہت اچھا ہے، مصنف نے تاریخی واقعات کو جمع کرنے میں بڑی مہارت دکھائی ہے اور ہر واقعہ کو دوسرے سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے، اس طرح یہ کتاب تاریخی کتاب ہے نہ کہ ناول - ناول کی زبان اگر اتنی پھیکی اور بے جان ہو تو فنی لحاظ سے یہ کتاب بالکل بے جان اور بے وقیع ہو جاتی ہے، ان کا اسلوب ایسا ہے کہ کسی ماتم خانہ میں ننس سفید گاؤن پہنے ہوئے ماتم کررہی ہیں، ان کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں اور ان کا گاؤن اتنا میلا ہے کہ دیکھنے والا پہلی نظر میں یہ کہہ دے گا کہ عرصہ سے ان کے گاؤن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی ہے، اس سے زیادہ کسی بے رونق اور بے جان اسٹائل کی تصویر کیا ہوسکتی ہے؟ یحییٰ حقی کا تنقیدی شعور ان کے مزاج، عالمی ادب کے مطالعہ اور ان کے فنی ذوق پر قائم ہے، گویا وہ اپنے تنقیدی نظریات کو بنیاد بناتے ہیں نہ کہ تنقیدی کتابوں کو پڑھ کر تنقید کو آگے بڑھائیں، ان کا کہنا ہے کہ ناقد کا فنی وادبی معیار مصنف کے معیار سے ہر لحاظ سے آگے ہونا چاہئے، اگر وہ اس سے کم ہے یا اس کے برابر ہی ہے تو اس کے تنقیدی نظریات بہت زیادہ مقبول نہیں ہوسکتے، اس سلسلہ میں ان کا بہت ہی علمی اور فنی مقالہ ہے جو انہوں نے شام کی وزارت ثقافت کی دعوت پر ۱۹۶۰ میں دمشق یونی ورسٹی میں پیش کیا تھا، اس مقالہ میں یحییٰ حقی کے تمام تنقیدی فکر کا پتہ چلتا ہے اور یہ مقالہ ان کی کتاب ''خطوات فی النقد'' میں شامل ہے، چنانچہ وہ اپنی دو کتابوں ''فجر القصة المصرية'' اور ''خطوات في النقد'' کی بہ دولت ایک ناقد کی حیثیت سے متعارف ہیں اور عرب نقادوں کا اتفاق ہے کہ وہ عصر حدیث کے ناقد ہی نہیں بلکہ تنقیدی رہنما بھی ہیں۔

❁❁❁

تفویضِ طلاق — ایک اہم عائلی مسئلہ

از:- ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج ☆

میاں بیوی کے مابین قائم ہونے والے رشتہ کو نکاح کہا جاتا ہے اور اس رشتے کے ٹوٹ جانے کو طلاق - نکاح میں دوطرفہ رضامندی ضروری ہوتی ہے مگر طلاق میں دوطرفہ رضامندی ضروری نہیں ہوتی، گو بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ طلاق بھی دوطرفہ رضامندی سے ہی وجود پذیر ہوتی ہے، فقہی اصطلاح میں ایسی طلاق کو طلاقِ مبارات کہتے ہیں - (مجموعہ قوانین اسلام، جلد ۲، ص ۶۰۲، جسٹس تنزیل الرحمٰن، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد)

شوہر کی طرف سے دی جانے والی طلاق (جو کہ یک طرفہ ہوتی ہے) کوفقط طلاق کہہ دیتے ہیں، بیوی اگر اپنے شوہر سے علاحدگی کا مطالبہ کرے اور اس کے مطالبہ پر شوہر اگر اسے چھوڑ دے تو ایسی طلاق کو ''خلع'' کہتے ہیں، اگر خلع کا مطالبہ، عدالت میں دائر کیا جائے جس کے نتیجے میں علاحدگی واقع ہو تو ایسی علاحدگی کو ''فسخِ نکاح'' کہتے ہیں، مذکورہ صورتوں میں کوئی صورت بھی ایسی نہیں کہ جس میں عورت حق طلاق میں خود مختار نظر آتی ہو، عورت کا عدالت میں جا کر طلاق کا مطالبہ کرنا بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ شریعت نے اسے طلاق دینے یا اسے اپنے اوپر وارد کرنے کے حق سے محروم کر رکھا ہے - طلاق اسے یا تو اس کا شوہر دے یا پھر ایمر جنسی کے حالات میں حاکم عدالت اپنے شرعی اختیار سے تفریق کرادے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عدالت وہ واحد مقام ہے کہ جہاں عورت کو ''حق طلاق'' استعمال کرنے کی اجازت دی جاسکتی تھی اور اس مقام پر اس کے برسر عدالت اقدام خلع کو طلاق کا بدل قرار دیا جاسکتا تھا مگر شریعت نے انصاف کی جگہ پر (اسلامی عدالت میں) بھی طلاق کا حق بہر حال عورت

☆ استاذ الفقہ والتفسیر، شعبۂ علوم اسلامی، جامعہ کراچی۔

کو نہیں دیا کیوں کہ

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ:۲۲۸) اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت ہے۔

میں مرد کو ایک گونہ فضیلت برائے ضرورت اسی حق طلاق میں دی گئی ہے، خدا کی طرف سے بخشی گئی یہ "فضیلت" مردوں کو نہیں شوہروں کو حاصل ہے اور شوہر چوں کہ ایک رشتے کا نام ہے اور رشتے کی فضیلت یہی ہے کہ وہ اس حق کو استعمال کرنے کا مجاز بنایا جائے، ہمارے خیال میں اگر کوئی شوہر اپنا یہ حق، اپنی زوجہ کو تفویض کرتا ہے تو دراصل وہ خدا کی شریعت میں تبدیلی کا جرم کرتا ہے، شریعت نے اسے یہ حق ہرگز نہیں دیا کہ وہ اپنا یہ حق زوجہ کو تفویض کرے اور زوجہ جب چاہے یہ حق استعمال کر کے اپنے خاوند سے الگ ہو جائے، اگر یہ عمل شریعت کی رو سے درست ہوتا تو شریعت طلاق کے عمل کو ہی دوطرفہ کر دیتی، پھر ایسا کرنے کی صورت میں خلع اور فسخ نکاح کی بھی حاجت نہ رہتی اور طلاق بہت آسان ہو جاتی۔

لیکن افسوس کہ ہماری کتب فقہ میں تفویض طلاق کے عنوان سے یہ حق، بیویوں کے حق میں تسلیم کر لیا گیا ہے، تفویض کے بعد طلاق کا حق صرف شوہر کے ہاتھ میں نہیں بلکہ بیوی کے ہاتھ میں بھی رہتا ہے، ان دونوں میں سے جو چاہے وہ اسے بغیر کسی رکاوٹ کے استعمال کر سکتا ہے۔

جسٹس (ریٹائرڈ) ڈاکٹر تنزیل الرحمان لکھتے ہیں:

"شوہر کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو حق طلاق تفویض کر دے مگر اس صورت میں خود اس کا حق طلاق ساقط نہ ہوگا۔ (توضیح) شوہر کے اپنی زوجہ کو حق طلاق تفویض کر دینے کی صورت میں زوجہ خود اپنے اوپر طلاق واقع کر سکتی ہے ...... اس حق کو استعمال کرنے کی صورت میں عورت شوہر کو طلاق نہیں دیتی بلکہ خود پر طلاق وارد کر کے رشتۂ زوجیت سے الگ ہو جاتی ہے۔

تفویض طلاق کا حق عورت کو کسی مدت معینہ تک بھی دیا جا سکتا ہے اور غیر معینہ مدت تک بھی، موخر الذکر صورت میں یہ حق کبھی واپس نہیں لیا جا سکتا، کیوں کہ تفویض کا اختیار ملنے کے بعد عورت اس حق کی خود مالک ہو جاتی، و لیس للزوج ان یرجع فی ذلک بعد ما جعل الیها و لا یفسخ، کذا فی الجوهرة (فتاوی عالم گیری، جلد ۲، ص ۶۷)، تفویض طلاق

کے بعد اگر شوہر نے یہ حق عورت سے پہلے استعمال کرتے ہوئے اسے طلاق بائن دے دی تو عورت کا اختیار باطل اور غیر نافذ ہو جائے گا"۔ (مجموعہ قوانین اسلام، جلد ۲، ص ۳۹۲ و ۳۹۳، ادارہ تحقیقات اسلامی، جامعہ اسلامیہ اسلام آباد، طبع سوم ۱۹۸۴ء)

تفویض طلاق کے عنوان سے مولانا عمر احمد عثمانی رقم طراز ہیں:

"تجھے اپنے بارے میں اختیار ہے" یا یہ کہ "تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے"، اس قسم کے الفاظ سے بھی تفویض ثابت ہو جائے گی، اگر اس کے بعد بیوی اس مجلس میں اپنے آپ کو طلاق دے لے تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی، نیز اس میں یہ بھی ممکن ہے کہ شوہر وقت کی تعیین کر دے کہ "تجھے اپنے بارے میں کل تک اختیار ہے" یا یہ کہ "تجھے اپنے بارے میں فلاں آدمی کے آجانے تک اختیار ہے" یا یہ کہ "تیرا معاملہ فلاں آدمی کے آجانے تک تیرے ہاتھ میں ہے" تو وقت مقررہ تک بیوی کو اختیار حاصل رہے گا اور اگر وہ خود کو طلاق دے لے تو ایک طلاق رجعی واقع ہو جائے گی لیکن یہ سب کچھ قرآن کے بیان کردہ تین مراحل سے گزر لینے کے بعد ہی ہو سکتا ہے"۔ (فقہ القرآن، ادارہ فکر اسلامی، کاشانہ حفیظ، ۲۴۰-اسیر داس اسٹریٹ، گارڈن ایسٹ کراچی، طبع دوم ۲۰۰۲ء)

غلام احمد پرویزؒ لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں جو احکام شریعت رائج ہیں، ان کی رو سے خاوند کو تو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے (Arbiterarily) بیٹھے بٹھائے بیوی کو طلاق دے دے لیکن اگر بیوی اس کے مظالم سے رستگاری حاصل کرنا چاہے تو اسے عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹانے پڑیں، اس کے لئے اصطلاح بھی الگ ہے یعنی "خلع"، جس کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں، مروجہ قانونِ شریعت کی رو سے زیادہ سے زیادہ یہ رعایت دی جاتی ہے کہ خاوند اگر چاہے تو اپنا حق طلاق مشروط یا غیر مشروط طور پر بیوی کو تفویض کر سکتا ہے، یعنی طلاق کا حق مرد ہی کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس مرد کے حبالۂ نکاح میں آنا چاہتی ہے یا نہیں لیکن جب وہ ایک دفعہ اس جبل (پھندے) میں پھنس جائے تو اس سے چھٹکارا پانے کا اسے کوئی اختیار نہیں رہتا، ظاہر ہے کہ یہ احکام ہمارے دور ملوکیت کے وضع کردہ ہیں"۔ (مطالب الفرقان، جلد ۳، ص ۳۹۲ و ۳۹۳، طلوع اسلام ٹرسٹ،

۲۵-بی-گلبرگ ۲ لاہور، بار سوم ۱۹۹۳ء)

پرویز صاحب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میاں بیوی کے درمیان طلاق کے حق کو یکساں دیکھنے کے حق میں ہیں، انہوں نے اس حق کو فقط مردوں میں محدود رکھنے کو عورتوں پر ظلم سے تعبیر کیا ہے اور خلع کو غیر شرعی قرار دیا ہے اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ خلع کا ذکر قرآن میں نہیں ہے (ان کا یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے، اس کی تفصیل ذرا آگے آتی ہے)، انہوں نے تفویض طلاق کو صرف اس لئے رد کیا ہے کہ ان کے بہ قول اس میں بھی طلاق کا حق مرد کو ہی حاصل ہوتا ہے، حالاں کہ ان کا یہ قول بھی درست نہیں، انہیں یہ قول اختیار کرنے سے پہلے تفویض طلاق کی مروجہ حقیقت جان لینی چاہئے تھی، اس ضمن میں ہدایہ، قدوری اور دیگر کتب فقہ کو پڑھ لینا چاہئے تھا، جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ تفویض کے بعد عورت اپنے اوپر خود طلاق وارد کرنے کی مجاز ہوجاتی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی طلاق کا ذکر آیا ہے، اس کی نسبت ہمیشہ مرد کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ طلاق دینے کا اختیار صرف مرد کو حاصل ہے مگر ہمارے بعض دانش وروں کو یہ امر خداوندی پسند نہ آیا یا یوں کہیے کہ ان کی سمجھ میں نہ آیا، اس لئے وہ اس امر کے مخالف ہوگئے اور اسے عورتوں پر ظلم سے تعبیر کرنے لگے، ہم سمجھتے ہیں کہ مرد کے حق طلاق پر معترض ہونے یا اس حق کو عورتوں میں منتقل کرنے کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن مجید میں شاید کوئی غلطی ہوگئی ہے جسے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بعض لوگوں نے درج ذیل آیت سے تفویض طلاق کا مسئلہ اخذ کیا ہے:

قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ، وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ۔(احزاب:۲۸و۲۹)

حالاں کہ اس سے تفویض طلاق کا مفہوم اخذ نہیں ہوتا بلکہ یہ آیت تو اس باب میں فیصلہ کن ہے کہ تفویض کا قانون، از روئے قرآن، کسی طرح بھی درست نہیں ہے، البتہ اس قانون کو اسی آیت کی رو سے مخالف قرآن ضرور قرار دیا جاسکتا ہے کیوں کہ قرآن مجید کے مطابق

آپ نے اپنی بیویوں سے فرمایا تھا کہ اگر تم دنیوی حیات اور اس کی رونق چاہتی ہو تو میرے پاس آؤ کہ میں تمہیں متاع دنیا دے دوں اور پھر تمہیں با حسن طریق اپنی زندگی سے نکال دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طلب گار ہو تو اللہ تعالیٰ نے تم نیکی کرنے والیوں کے لئے بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

ان آیتوں میں حیات دنیوی اور اس کی تحسینات کے مقابلہ پر اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کو رکھا گیا ہے اور ازواج مطہرات کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرلیں، اس بنا پر ہمارے مفسرین نے اس امر کو حق تخییر سے تعبیر کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ازواج پاک اگر رسول محترم کے مقابلہ پر، حیات دنیوی اور اس کی زینت کو اختیار کرلیتیں تو کیا رسول گرامی ﷺ سے طلاق لئے بغیر ایسا ممکن تھا؟ ہرگز نہیں کیوں کہ آیت مذکورہ میں ''فتعالین'' کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ دنیوی حیات کو ترجیح دینے کی صورت میں رسول انہیں اپنے پاس بلا رہے ہیں.......... اور ''وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا'' کے الفاظ تو صراحت کے ساتھ طلاق کے مفہوم پر دلالت کررہے ہیں۔

امام راغب اصفہانیؒ نے لکھا ہے:

والتسریح فی الطلاق نحو قولہٖ تعالی (او تسریح باحسان) و قولہٗ (و سرحوھن سراحا جمیلا) مستعارٌ من تسریح الابل کالطلاق فی کونہ مستعاراً من اطلاق الابل ۔(المفردات فی غریب القرآن، ص ۲۳۰، نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، کراچی)

اور تسریح معنیٔ طلاق میں نص ہے، اللہ کے اس قول کے مطابق (یا انتہائی بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے) اور اس کے اس قول کے مطابق بھی (اور انہیں اچھی طرح سے رخصت کردو)، یہ تسریح سے مستعار ہے، جس کے معنی جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دینے کے ہیں، جیسا کہ طلاق کا لفظ (اطلاق الابل) اونٹ کو کھولنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ڈکشنری آف ماڈرن رٹن عربک میں تسریح کے درج ذیل معنی لکھے گئے ہیں:

Dismissal - Discharge - Release - Demolization -

(J.Milton Cown - Page.406. OTTO HARRASSOWITZ WIESBADEN - 1961)

واضح ہو کہ "واسرحکن" اور "سراحا" کا مادہ "سرح" ہے اور سرح کا معنی ہے کھلا چھوڑ دینا، سَرَّحَ الزوجۃ کے معنی ہیں بیوی کو طلاق دینا، المنجد (عربی-اردو) اور تسریح کے معنی ہیں قید نکاح سے آزاد کر دینا، سَرَّحَ یُسَرِّحُ تسریح سے ہی بنا ہے، اُسَرِّحْکُنَّ جس کا مطلب ہے تمہیں اچھی طرح سے رخصت کر دوں یعنی طلاق دے دوں، ان الفاظِ قرآنی سے پتہ چلتا ہے کہ "تخییر" کا مفہوم تفویض طلاق پر منطبق نہیں ہوسکتا، مگر اس کے باوجود بعض علما نے اسے تفویض طلاق پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے، اس پر ہمیں تعجب ہے، مثلاً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

"اصطلاح میں اس کو تخییر کہتے ہیں، یعنی بیوی کو اس امر کا اختیار دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جدا ہو جانے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کرلے، یہ تخییر نبی ﷺ پر واجب تھی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حضور ﷺ کو حکم دیا تھا، اگر ازواج مطہرات میں سے کوئی خاتون علاحدگی کا پہلو اختیار کرتیں تو آپ سے جدا نہ ہو جاتیں بلکہ حضور ﷺ کے جدا کرنے سے ہوتیں"۔

ذرا آگے چل کر اگلے پیراگراف میں لکھتے ہیں:

"اسلامی فقہ میں تخییر دراصل تفویض کی حیثیت رکھتی ہے، یعنی شوہر اس ذریعہ سے بیوی کو اختیار دے دیتا ہے کہ چاہے تو اس کے نکاح میں رہے، ورنہ الگ ہو جائے"۔ (تفہیم القرآن، جلد ۴، ص ۸۵)

ان دونوں عبارتوں کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سید مودودیؒ کے ہاں تخییر اور تفویض طلاق ایک ہی طرح کی دو چیزیں ہیں، مگر وہ ان دونوں کے درمیان یہ فرق بھول گئے کہ تخییر میں از خود جدا ہونے کا حق آپ ﷺ کی ازواج کو ہرگز حاصل نہ تھا، تاوقتیکہ آپ ﷺ ان کو طلاق نہ دے دیتے، جیسا کہ اول الذکر پیراگراف میں انہوں نے خود بھی یہی لکھا ہے جبکہ تفویض طلاق میں یہ حق عورت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، عورت کو جدا ہونے کے لئے شوہر کے

طلاق کی ضرورت نہیں پڑتی، پھر اتنے واضح طرق کے بعد تخییر اور تفویض دونوں کو یکساں قرار دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟۔

سید امیر علیؒ (مترجم فتاوی عالم گیری) لکھتے ہیں:

.... یہاں جس خیار میں کلام ہے وہ یہ ہے کہ مرد نے عورت کو طلاق کی نیت سے خیار دیا حتی کہ اگر اس نے اختیار کیا تو واقع ہوگئی اور آنحضرت ﷺ نے کسی کو یہ خیار نہیں دیا تھا، اس خیار کے معنی وہ ہیں جو قرآن مجید میں فرمایا قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا یعنی اے محمد! اپنی بیبیوں کو فرمائیں کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں تمتع دوں اور اچھی طرح طلاق دے کر آزاد کروں، اس سے صریح ہے کہ آپ ﷺ نے اختیار سے پسند کے معنی لئے تھے اور یہی لغت وعرف میں شائع ہیں، چنانچہ رسولِ مختار یعنی پسند کئے ہوئے پیغمبر اور بولتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ امر مختار ہے اور میں نے یہ اختیار کیا یعنی پسندیدہ یہ ہے، پس آنحضرت ﷺ نے موافق حکم آیت کے بیویوں سے کہہ دیا کہ دنیا کی زینت یا رسول اللہ و آخرت ان دونوں میں سے تم کو کیا بات پسند ہے اور یہ کچھ طلاق نہیں تھی، حتی کہ اگر وہ جواب دیں کہ ہم نے دنیا پسند کی تو طلاق نہیں واقع ہو جاتی بلکہ وعدہ دیا تھا کہ اگر تم دنیا پسند کروگی تو ہم ایسا کریں گے۔

الحاصل یہ خیار جس میں بحث ہے عورت کے ہاتھ میں طلاق یا اس کے نفس کا اختیار دینا مراد ہے اور آنحضرت ﷺ نے جو خیار دیا تھا اس میں دنیا و اس کا مال پسند کرنا یا آخرت و رسول اللہ ﷺ کو پسند کرنا ان دونوں میں اختیار دیا تھا اور یہ صریح نص قرآن ہے.........."۔

(عین الہدایہ اردو شرح الہدایہ، جلد ۲، ص ۲۴۱، مکتبہ رحمانیہ، اقرأ سینٹر، ۱۸-اردو بازار، لاہور، طبع اول ۱۹۹۲ء)

اس اقتباس میں آیت تخییر کو تفویض طلاق سے غیر متعلق قرار دیا گیا ہے، دراصل اس عبارت سے ہمیں یہی دکھانا مقصود تھا کہ تفویض طلاق کے غیر قرآنی ہونے کو واضح کیا جا سکے اور جو لوگ تخییر سے تفویض ثابت کرتے ہیں، ان کا خلطِ مبحث نمایاں ہو سکے۔

نکاح کے ذریعے میاں بیوی ایک دوسرے کے زوج قرار پاتے ہیں، اس زوجیت کے رشتے میں مرد ناکح ہوتا ہے اور عورت منکوحہ، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ عورت ناکح ہو اور مرد منکوحہ، اسی لئے تو بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ: ۲۳۷) میں گرہ نکاح کا جس کے ہاتھ میں ہونا بیان ہوا ہے، وہ مرد ہے نہ کہ عورت، اس لئے کہ بِيَدِهٖ میں ہ ضمیر مذکر کی ہے اگر ضمیر مؤنث کی ہوتی تو گرہ نکاح کو عورت کے ہاتھ میں سمجھا جاتا، اس طرح عورت ناکح بھی ہوتی اور اس گرہ کو کھولنے کی مجاز بھی مگر شریعت نے ایسا نہیں کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نہیں چاہتا کہ گرہ نکاح عورت کے ہاتھ میں ہو، جب کہ تفویض طلاق میں گرہ نکاح عورت کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور وہ حق طلاق کو خود اپنے ہی خلاف استعمال کر کے اپنے شوہر سے الگ ہو جاتی ہے گویا خود ہی طالقہ ہوتی ہے اور خود ہی مطلقہ بھی، یعنی فاعلہ بھی خود اور مفعولہ بھی خود، یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی شخص خود اپنے آپ سے نکاح کر لے، گویا خود ہی ناکح ہو اور خود ہی منکوحہ۔ ذرا سوچئے کہ تفویض طلاق کی صورت حال کس قدر مضحکہ خیز ہے، کوئی ہے جو اس پر غور کرے؟۔

"عقدۂ نکاح" کی نسبت مرد کے تعلق سے ایک آیت پیش تر بھی مذکور ہے، اپنے موقف کی تائید میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں، ارشاد پاک ہے:

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ (البقرہ: ۲۳۵)

اور معاہدۂ نکاح کو پختہ کرو جب تک بیوہ عورتوں کی عدت مکمل نہ ہو لے۔

تفویض طلاق کی بابت کچھ حقائق منتخب مفسرین کے حوالہ سے بھی ملاحظہ ہوں:

مفتی احمد یار خاں نعیمیؒ رقم طراز ہیں:

"عورتوں کو طلاق کا حق دینا گویا دیوانہ کے ہاتھ میں تلوار دینا ہے، پھر دن بھر میں پانچ پانچ طلاقیں ہوں گی، دیکھو آج امریکہ اور انگلینڈ میں طلاقوں کی کیسی بھرمار ہے کہ وہ لوگ چیخ پڑے ہیں"۔ (اشرف التفاسیر المعروف بہ تفسیر نعیمی، جلد ۴، ص ۱۲۵، مکتبۂ اسلامیہ، مفتی احمد یار خاں، روڈ، گجرات)

مزید فرماتے ہیں: "طلاق کا حق صرف مرد ہی کو ہے نہ کہ عورت کو"۔ (تفسیر نعیمی، جلد ۲، ص ۵۶۸، تفسیر زیر آیت ۲۲۷، سورۂ بقرہ)

اس عبارت میں "صرف" کا لفظ قابل توجہ ہے۔

نیز فرماتے ہیں: .... نکاح کی گرہ مرد کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے، طلاق کا اس کو ہی حق ہے، عورت کو نہیں، نہ خلع میں نہ بغیر خلع۔ یعنی خلع میں مرد کی مرضی پر طلاق موقوف ہوگی، آج کل عوام نے جو خلع کے معنی سمجھے ہیں کہ عورت اگر مال دے دے تو بہر حال طلاق ہو جائے گی، خواہ مرد طلاق دے یا نہ دے، یہ غلط ہے۔ (نور العرفان، تفسیر زیر آیت ۲۳۷، سورہ بقرہ، پیر بھائی کمپنی، لاہور)

مفتی محمد شفیعؒ ارقام فرماتے ہیں:

"نکاح مکمل ہو جانے کے بعد نکاح کو قائم رکھنے یا ختم کرنے کا مالک شوہر ہے، طلاق وہی دے سکتا ہے، عورت کا طلاق میں کوئی اختیار نہیں"۔ (معارف القرآن، جلد اول، ص ۵۸۸، ادارۃ المعارف کراچی، ۱۹۸۴ء)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ فرماتے ہیں:

"......... گویا یہ رشتہ اصلاً شریعت نے مرد ہی کے اختیار میں رکھا ہے، اس وجہ سے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان جو مغرب کی نقالی میں ہمارے مسلمان ممالک میں بڑھتا جا رہا ہے، شریعت کے بالکل خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ بالکل پراگندہ ہو کر رہ جائے گا"۔ (تدبر قرآن، جلد اول، ص ۵۴۹، تفسیر زیر آیت ۲۳۷، سورہ البقرہ، قاران فاؤنڈیشن، ۱۲۲، فیروز پور روڈ، اچھرہ لاہور، ۱۹۸۳ء)

اسی طرح مولانا غلام رسول سعیدیؒ نے بھی شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے:

"عورت کے ناقص العقل ہونے کی بنا پر عقد نکاح کے ارتفاع یعنی طلاق کا اختیار عورت کو نہیں دیا گیا بلکہ معاملہ کلیۃً مرد کے اختیار میں ہے"۔ (جلد ۳، ص ۸۲۵، فرید بک اسٹال، اردو بازار لاہور، الطبع السادس، ۱۹۹۷ء)

نیز فرماتے ہیں:

"طلاق دینے کا حق صرف مرد کو تفویض کیا گیا ہے، حالاں کہ عقد نکاح عورت اور مرد دونوں کی باہمی رضامندی سے وجود میں آتا ہے تو پھر عورت کو یہ اختیار کیوں نہیں ہے کہ وہ جب

چاہے اس عقد کو ختم کردے؟ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ عورت مغلوب الغضب ہوتی ہے اور اس کو جلد غصہ آتا ہے، اگر طلاق دینے کا معاملہ عورت کے اختیار میں ہوتا تو وقوع طلاق کی شرح دو چند سے بھی زیادہ بڑھ جاتی - عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ عورت کے مطالبہ اور اس کی ضد پر شوہر طلاق دیتا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی قوت فیصلہ کم زور ہوتی ہے، خصوصاً خاص ایام میں عورت ذہنی اضطراب میں مبتلا ہوتی ہے اور ان ایام میں اس کا ذہن منتشر اور مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے، اس لئے اگر طلاق دینے کا معاملہ عورت کے سپرد کیا جاتا تو شرح طلاق زیادہ ہو جاتی اور اکثر ہنستے بستے گھر ویران ہو جاتے، تیسری وجہ یہ ہے کہ عورتیں ناقصات العقل ہوتی ہیں جیسا کہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابن ماجہ، سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبل اور مستدرک میں اس کی تصریح ہے اور فسخ نکاح کا معاملہ ناقص العمل کے سپرد کرنے کے لائق نہیں ہے، طلاق کا معاملہ مرد کو مفوض کرنے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ چوں کہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لئے ان حقوق سے دست کش ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے......

علاوہ ازیں یہ اقدام عدل وانصاف کے بھی خلاف ہوتا، ذرا آگے چل کر رقم طراز ہیں:

"کیوں کہ عمل زوجیت اور نفقہ کی ادائیگی میں مرد فاعل ہوتا ہے اور عورت اس کے فعل کی محل یا منفعل ہوتی ہے، اس لئے عقد نکاح کو قائم رکھنے یا اس کو فسخ کرنے کا اختیار بھی صرف مرد کو دیا گیا ہے"۔ (تبیان القرآن، جلد اول، ص ۸۵۲-۸۵۴، الطبع الثالث ۱۹۹۹ء)

تفویض طلاق کو سمجھنے کے لئے خلع کے قانون کا سمجھنا بہت ضروری ہے، ہمارے نزدیک خلع کا قانون اپنی فطرت اور اصل میں تفویض طلاق کے قانون کا نقیض ہے۔

ابن رشد مالکی لکھتے ہیں:

"خلع کا فلسفہ یہ ہے کہ خلع عورت کے اختیار میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ مرد کے اختیار میں طلاق ہے، چنانچہ جب عورت کو مرد کی طرف سے کوئی تکلیف ہو تو اس کے اختیار میں خلع ہے اور جب مرد کو عورت کی طرف سے تکلیف ہو تو شارع نے اسے طلاق کا اختیار دیا ہے"۔

(بدایۃ المجتہد، جلد ۲، ص ۶۸، مطبوعہ مصر ۱۳۷۹ھ)

طلاق کی صورت میں شوہر کو کہا گیا ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو ڈھیروں مال بھی دے چکے ہو

تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو، سوائے اس صورت کے کہ بیوی سے بے حیائی کا ارتکاب ہو گیا ہو۔

وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ

(النساء:۱۹)

اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ اگر وہ (یعنی تمہاری بیویاں) تمہارے نکاح میں نہ رہنا چاہیں تو انہیں اس نیت سے زبردستی روکے رکھو کہ جو تم انہیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس مل جائے، سوائے اس کے کہ وہ کھلی بدکاری کی مرتکب ہوں۔

اسی طرح اگر طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہوا ہو تو بھی عورت سے کچھ لیا جاسکتا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ

(البقرہ:۲۲۹)

اور تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ جو کچھ تم عورتوں کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ بھی واپس لے لو، مگر یہ کہ دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہیں رہ سکیں گے، پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ فریقین اللہ کی حدود پر قائم نہیں رہ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی الزام نہیں کہ عورت خلع کے لئے اپنے حق میں سے کچھ چھوڑ دے۔

جس صورت طلاق کا ذکر یہاں ہے، اسے اصطلاح شریعت میں خلع کہتے ہیں، طلاق اور خلع میں فرق یہ ہے کہ جب طلاق کا مطالبہ عورت کی طرف سے ہوا ہو اور مرد اس مطالبہ کو پورا کردے تو اسے خلع کہتے ہیں اور جب مرد محض اپنی خواہش سے عورت کو اپنے سے جدا کرنا چاہے تو اسے طلاق کہتے ہیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مہر کا ادا کرنا یا ادا شدہ مہر کا واپس نہ لینا، مردوں کے حق طلاق کے غیر ضروری استعمال کو روکنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، اسے کسی درجہ میں ایک طرح کی روک کہا جاسکتا

ہے، بعینہ عورت کے بے جا مطالبہ خلع کو روکنے کے لئے مہر یا مہر کے کچھ حصے کی واپسی نیز حاکم
عدالت تک رسائی کو بھی ایک اہم ذریعہ بنایا گیا ہے اور اسے بھی کسی درجہ میں روک کہا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی آیت کی تفہیم میں جمیلہ بنت عبداللہ اور ثابت بن قیس کا واقعہ ہماری
رہنمائی کرتا ہے جو صحیح احادیث میں آیا ہے، اس واقعہ میں مذکورہ عورت کی خواہش پر مذکورہ مرد
نے رسول اللہ ﷺ کے کہنے پر طلاق دی، خلع کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

اس آیت میں ایک چیز قابل توجہ ہے، آیت کے ابتدائی حصے میں وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ
تَأْخُذُوا آیا ہے، اس میں مخاطب کی ضمیر آئی ہے اور مراد شوہر ہیں جب کہ فَإِنْ خِفْتُمْ میں
بھی یہی ضمیر آئی ہے مگر اس سے شوہر مراد نہیں ہیں بلکہ حکام عدالت یا بہ حیثیت مجموعی مسلمان
مراد ہیں، نحوی حضرات اپنی اصطلاح میں اسے انتشار ضمائر کہتے ہیں اور اسے جائز و روا رکھتے ہیں،
قرآن میں اس طرح کی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔

آیت کو بحیثیت مجموعی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں خلع کی دو قسمیں مذکور ہوئی ہیں،
قسم اول میں اس خلع کا بیان ہے جو گھر کے اندر رہتے ہوئے خوش اسلوبی سے طے ہوجائے اور قسم
ثانی میں اس خلع کا جس کے لئے عورت کو قاضی کی عدالت میں جانا پڑے، بہر دو صورت خلع مطالبۂ
طلاق کا نام ہے، خواہ وہ شوہر دے یا حاکم عدالت میں ان میں تفریق کرائے، اسی بات کو مولانا
صلاح الدین یوسف نے اپنی تفسیر میں یوں لکھا ہے کہ "خلع بذریعہ طلاق بھی ہوسکتا ہے اور بذریعہ
فسخ بھی" (تفسیر زیر آیت ۲۲۹)، پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے لکھا ہے" ...... عورت حاکم وقت کے
پاس خلع کا مطالبہ کرے اور حاکم پہلے ان کی مصالحت کی کوشش کرے گا، اگر کامیابی نہ ہوتو خاوند نے
عورت کو مہر میں جو کچھ دیا تھا حاکم اسے لے کر خاوند کو واپس کردے اور ان کے درمیان تفریق کرادے
یہ خلع ہے"۔ (ضیاء القرآن، جلد اول، ص ۱۵۸، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، گنج بخش روڈ لاہور، طبع اول ۱۴۰۲ھ)

خلاصہ کے طور پر عرض ہے کہ طلاق یعنی زوجین کے مابین جدائی کی جو قسمیں قرآن سے
ماخوذ و مستنبط ہیں، ان میں ایک تو طلاق ہے، دوسری خلع اور تیسری فسخ نکاح ہے، یہ تینوں قسمیں
اپنے حوالوں کے ساتھ اوپر مذکور ہوچکیں اور تینوں کی موجودگی میں تفویض طلاق کا قانون ہماری
نظر میں خدائی شریعت میں کسی نقص اور کمی کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔

سوانح مولانا روم پر ایک نظر

از:- پروفیسر شریف حسین قاسمی☆

حضرت علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے فارسی ادب پر جو گراں قدر کام انجام دیا ہے، اس کی
اہمیت سے انکار ممکن نہیں، فارسی ادب پر علامہ مرحوم کی سب سے بنیادی اور اہم کتاب "شعر العجم"
ہے جو شروع سے آج تک فارسی کے اساتذہ اور طلبا میں یکساں طور پر مقبول رہی ہے، اس کتاب
کے کچھ حصے پر محمود شیرانی صاحب کی تنقید شعر العجم اپنی نوعیت کی ایک ایسی کتاب ہے جس کی
افادیت مسلم ہے، شیرانی صاحب کو فارسی ادب کے ایک ناقد کی حیثیت سے سب ہی احترام کی
نگاہ سے دیکھتے ہیں، تحقیق وتنقید کے میدان میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے، شیرانی صاحب
نے شعر العجم کا تنقیدی نگاہ سے جائزہ لیا ہے اور حضرت علامہ شبلی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"علامہ شبلی مرحوم زمانہ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن
کا وجود مسلمانوں کے لئے ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا، ان کی متعدد تصنیفات نے
آسمان علم پر ان کو آفتاب بنا کر چمکایا ہے ...... مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد
ایسے زمانے میں ڈالی جب فن تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہوچکا تھا، اردو
زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت
میں تھا، ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست
اور قابل قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی ...... فارسی نظم کی
تاریخ میں اردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے شعر العجم تصنیف کی،
اس موضوع پر اب تک فارسی اور اردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں، شعر العجم

☆ دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہے .... شعرالعجم کے
مطالعے کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی ہے کہ علامہ شبلی اس تصنیف کے
دوران میں مورخانہ ومحققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل
رہے ہیں"۔[1]

شیرانی صاحب کی تنقید شعرالعجم سے یہ پتا چلتا ہے کہ علامہ شبلی جہاں تک فارسی ادب کا تعلق ہے، تحقیق کے آدمی نہیں، جو اطلاعات بہ آسانی نہیں دست یاب ہوئیں انہیں پر قناعت کی، زیادہ تحقیق وتلاش سے کام نہیں لیا، یہ ایک امر واقعی ہے لیکن حضرت علامہ نے فارسی شعرا کے کلام پر جو تنقیدی نگاہ ڈالی ہے، اس کی مناسبت، اہمیت اور بعض موارد میں اولیت سے انکار بھی ممکن نہیں۔

"سوانح مولانا روم" کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں مولانا کی سوانح کا حصہ مختصر ہے لیکن مولانا کی مثنوی پر حضرت علامہ نے جس زاویے سے نگاہ ڈالی ہے، اس کی انفرادیت مسلم ہے۔

حضرت علامہ کی یہ کتاب کئی بار چھپی ہے، دہلی سے اور لاہور سے، لاہور سے اسے سید عابد علی عابد صاحب نے شائع کیا ہے[2]، اس پر ایک مختصر مقدمہ ہے لیکن اس میں اس کتاب کا تعارف نہیں ہے، اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی صاحب نے بھی حضرت علامہ کی سوانح میں اس کتاب کا کوئی خاص تعارف نہیں کرایا ہے۔

"سوانح مولانا روم" میں مولانا روم کی مثنوی کے ایک پہلو پر خاص طور بحث کی گئی ہے اور یہ اس لئے خاصہ کی چیز ہے کہ اس انداز اور اس زاویے سے شاید مثنوی کے تعارف کی یہ اولین مکمل کوشش ہے، یہ پہلو ہے مثنوی مولانا کا علم کلام کی روشنی میں مطالعہ۔

خود حضرت شبلی نعمانی اپنی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مولانا روم کو دنیا جس حیثیت سے جانتی ہے، وہ فقر وتصوف ہے اور اس
لحاظ سے متکلمین کے سلسلے میں ان کو داخل کرنا اور اس حیثیت سے ان کی سوانح عمری

۱؎ تنقید شعرالعجم: حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۲، ص ۱-۴۔ ۲؎ مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور۔

لکھنا لوگوں کو موجب تعجب ہوگا لیکن ہمارے نزدیک اصلی علم کلام یہی ہے کہ
اسلام کے عقائد کی اس طرح تشریح کی جائے اور اس کے حقائق ومعارف اس
طرح بتائے جائیں کہ خود بہ خود دل نشین ہوجائیں، مولانا نے جس خوبی سے اس
فرض کو ادا کیا ہے، مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے، اس لئے ان کو زمرۂ متکلمین
سے خارج کرنا سخت ناانصافی ہے"۔[1]

اس کے یہ معنا ہوئے کہ علامہ مثنوی مولانا روم پر ایک متکلم کی حیثیت سے روشنی ڈال رہے ہیں اور انہوں نے اس مثنوی میں عرفانی امور کا اس طرح مطالعہ نہیں کیا جس طرح کیا جانا چاہئے تھا، چوں کہ خود ان کے بہ قول وہ اس کوچے سے بالکل نابلد ہیں۔[2]

علامہ شبلی مولانا روم کی حیات پر اپنے ماخذ کا ذکر بھی کرتے ہیں، وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"مولانا کے حالات وواقعات عام تذکروں میں مختصراً ملتے ہیں،
سپہ سالار ایک بزرگ مولانا کے مرید خاص تھے اور مدت تک فیض صحبت اٹھایا
تھا، انہوں نے مولانا کی مستقل سوانح عمری لکھی تھی، مناقب العارفین میں بھی ان کا
مفصل تذکرہ ہے، میں نے زیادہ تر ان ہی دونوں کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے"۔[3]

حضرت علامہ ان دونوں ماخذ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ کتابیں قدیم مذاق پر لکھی گئی ہیں اور اس لئے ضروری اور یہ کارآمد
باتیں کم ملتی ہیں"۔[4]

حضرت علامہ نے اس فقدان کی تلافی اس طرح کی ہے کہ:

"مولانا کے کلام اور بالخصوص مثنوی پر نہایت مفصل تبصرہ لکھا ہے"۔[5]

علامہ شبلی نے سوانح مولانا روم کے بارے میں دو بنیادی ماخذ کا ذکر کیا ہے، ایک مناقب العارفین اور دوسرا رسالہ سپہ سالار، یہ دونوں مولانا روم کی حیات پر بنیادی ماخذ ہیں، مناقب العارفین احمد افلاکی کی کتاب ہے، جس میں مولانا کے احوال واقوال نقل ہوئے ہیں، مولانا روم بہ قول علامہ شبلی

۱؎ سوانح مولانا روم: علامہ شبلی نعمانی، شاہ جہانی پریس دہلی، ص ا۔ ۲؎ سوانح مولانا روم، ص ۱۱۵۔
۳؎ ایضاً، ص ۱-۲۔ ۴؎ ایضاً۔ ۵؎ ایضاً۔

۶۰۴ھ میں بہ مقام بلخ پیدا ہوئے اور ۶۷۲ھ کو قونیہ میں واصل بہ حق ہوئے۔

مناقب کی تالیف ۷۱۸ھ میں شروع ہوئی اور افلاکی نے اسے ۷۵۴ھ میں مکمل کیا، یعنی مولانا کی وفات کے صرف ۴۶ برس بعد اس کی تالیف شروع ہوئی، اس لئے مناقب العارفین کو مولانا کے احوال و آثار پر ایک اہم ماخذ شمار کیا جاتا ہے، یہ ایران سے شائع ہو چکی ہے۔

علامہ شبلی سوانح مولانا روم کے سلسلے میں ایک دوسرے ماخذ کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہے رسالہ سپہ سالار، یہ "رسالہ فریدون بن احمد سپہ سالار" کے عنوان سے ایران سے شائع ہو چکا ہے۔[1]

ان دو ماخذ کے علاوہ علامہ شبلی نے مولانا روم کی زندگی بیان کرنے کے لئے دیگر ماخذ کا بھی استعمال کیا ہے، مثلاً مدینۃ العلوم ارنیقی، دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعراء، ابن خلدون، حبیب السیر، نفحات الانس جامی، جواہر مضیئہ، کشف الظنون وغیرہ۔

حضرت علامہ نے سوانح مولانا کے ضمن میں ان کا نام، حسب و نسب، تعلیم و تربیت، ان کے اسفار، ان کے اساتذہ، شمس تبریزی سے ان کی ملاقات، شمس کا گم ہو جانا، صلاح الدین زرکوب کی صحبت، مولانا کی بیماری اور وفات، اولاد، سلسلۂ باطنی، اخلاق و عادات، ریاضات شاقہ، امرا کی صحبت سے اجتناب، وجد و استغراق وغیرہ کو بیان کیا ہے۔

علامہ شبلی نے مولانا کی تمام تصانیف کا حتماً ذکر بھی نہیں کیا ہے، مولانا کی درج ذیل کتابیں عام طور پر دست یاب ہیں:

۱-مثنوی چھ جلدوں میں   ۲-دیوان   ۳-رباعیات
۴-مکتوبات مولانا   ۵-فیہ مافیہ   ۶-مجالس سبعہ

علامہ شبلی نے فیہ مافیہ جو مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے وقتاً فوقتاً معین الدین پروانہ کو لکھے تھے، کا مطالعہ نہیں کیا، علامہ شبلی کے بہ قول "یہ کتاب بالکل نایاب ہے"، یہ صحیح بھی ہے اس لئے کہ یہ کتاب علامہ شبلی کے زمانے میں شائع نہیں ہوئی تھی لیکن اب بہ آسانی دست یاب ہے اور مولانا کی زندگی اور افکار کو سمجھنے کے لئے ایک اہم ماخذ شمار کی جاتی ہے، علامہ شبلی کو یہ کتاب دست یاب نہیں ہوئی اور انہوں نے اس کا تعارف نہیں کرایا۔

[1] بہ تصحیح و مقدمہ سعید نفیسی، تہران ۱۳۲۵۔

دیوان شمس تبریز، مثنوی، علامہ شبلی مولانا روم کی دوسری تصانیف، مکتوبات، مجالس سبعہ کا اصلاً ذکر ہی نہیں کرتے جس کے معنا ہیں کہ شبلی ان کتابوں سے بھی واقف ہی نہیں تھے، حالانکہ ان کے خطی نسخے ہمارے یہاں بھی مشرقی کتاب خانوں میں مل جاتے ہیں۔

بہر حال علامہ شبلی مولانا روم کے دیوان کا تعارف کرانے سے پہلے یہ کہتے ہیں کہ:

غرض مولانا کی تصنیفات میں آج جو کچھ ہے وہ دیوان اور مثنوی ہے، چنانچہ ہم ان دونوں پر تفصیل کے ساتھ تبصرہ (ریویو) لکھتے ہیں۔

حضرت علامہ نے مولانا روم کی غزلیات کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ ان کے گہرے مطالعے کی ترجمان ہیں، مولانا روم کی غزلیات پر متعدد ایرانی ناقدین نے اظہار خیال کیا ہے لیکن حضرت علامہ کی ناقدانہ نگاہ جہاں جہاں پہنچی ہے وہاں وہاں شاید ہی کسی کی نگاہ پہنچی ہو، حضرت علامہ نے مولانا روم کی غزلیات کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- مولانا کی غزلیات کا سعدی اور عراقی کی غزلیات سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، سعدی اور عراقی کی غزلیات مولانا کی غزلیات سے بہتر ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کی عام مقبولیت اور دل آویزی کا بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ اس میں مجاز کا پہلو غالب رکھا جائے اور اس قسم کے حالات اور معاملات بیان کئے جائیں جو ہوس پیشہ عشاق کو اکثر پیش آیا کرتے ہیں، مولانا کے کلام میں حقیقت کا پہلو اس قدر غالب ہے کہ رندوں اور ہوس بازوں کو جو غزل کی اشاعت اور ترویج کے نقیب ہیں، اپنے مذاق کے موافق بہت کم سامان ہاتھ آتا ہے۔

یہاں مجھے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی وہ گفتگو یاد آتی ہے جو انہوں نے خسرو سے شاعری کے بارے میں کی تھی، جس زمانے میں امیر خسرو نے شعر کہنا شروع کیا، وہ جو نظم کہتے، سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کرتے، ایک روز سلطان المشائخ نے ان سے فرمایا کہ صفاہانیوں کے طرز پر شعر کہا کرو جو عشق انگیز بھی ہوں اور زلف و خال آمیز بھی، اس روز سے امیر خسرو نے اپنی شاعری میں زلف اور خال بتاں کی آمیزش کر کے اور اپنے اشعار کو نئی نئی تشبیہوں اور استعاروں سے دل آویز بنا کر انتہائے کمال پر پہنچا دیا۔[1]

[1] سیر الاولیا: امیر خورد کرمانی، اردو ترجمہ از اعجاز الحق قدوسی، لاہور ۱۹۸۰ء، ص ۴۷۱۔

غزل کے بارے میں حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے تقریباً وہی بات خواجہ نظام الدین اولیا نے بھی کہی ہے، محض الفاظ کا فرق ہے۔

۲- مولانا کی غزلیات میں زبان کی ایک برائی یہ ہے کہ: فک اضافت جو شاعری کی شریعت میں ابغض المباحات ہے، اس کو مولانا اس کثرت سے برتتے ہیں کہ جی گھبرا جاتا ہے۔

۳- اکثر غزلیں کسی خاص حالت میں لکھی گئی ہیں، اس لئے ان میں ایک ہی حالت کا بیان چلا جاتا ہے۔

۴- مولانا کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے، اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

۵- بڑی خصوصیت ان کے کلام کی یہ ہے کہ عشق اور محبت کے جوش میں عاشق پر جو خاص حالتیں گزرتی ہیں، ان کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھنچ جاتی ہے اور یہ شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے۔

۶- تصوف کے مقامات میں دو مقام آپس میں متقابل ہیں، فنا و بقا، مقام فنا میں سالک پر خضوع، مسکینی اور انکساری کی کیفیت غالب ہوتی ہے، بہ خلاف اس کے بقا میں سالک کی حالت جلال اور عظمت سے لبریز ہوتی ہے، مولانا پر یہی نسبت غالب رہتی تھی اس لئے ان کے کلام میں جو جلال، ادعا، بے باکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے، صوفیا میں کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

مولانا کی غزلیات کی یہ خصوصیات بیان کرنے کے بعد علامہ شبلی مولانا کی مثنوی پر اظہار خیال شروع کرتے ہیں، وہ فارسی شاعری کی ایک مختصر تاریخ لکھتے ہیں، مثنوی کے بارے میں یہ صحیح لکھتے ہیں کہ مولانا نے حسام الدین چلپی کی درخواست پر اپنی مثنوی لکھنی شروع کی۔

علامہ شبلی مثنوی کی مقبولیت کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا نثر میں لکھی گئی ہیں، کسی میں ایسے دقیق نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، فارسی پر موقوف نہیں، اس قسم کے نکات اور دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتا لگتا ہے، اس لحاظ سے اگر علما اور ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں تک

مبالغہ کیا کہ "ہست قرآن در زبان پہلوی" کو کچھ تعجب کی بات نہیں، یہ خود مولانا نے اقرار کیا ہے کہ:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او   ما از پئی سنائی و عطار آمدیم

اس کے پیش نظر علامہ فرماتے ہیں کہ: یہ امر یقینی ہے کہ مولانا نے حدیقہ سنائی اور منطق الطیر عطار کو سامنے رکھ کر مثنوی لکھی ہے اور وہ خود اس سلسلے میں کہتے ہیں:

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام   از حکیم غزنوی بشنو تمام

در الٰہی نامہ گوید شرح ایں   آں حکیم غیب و فخر العارفین

علامہ حدیقہ پر مثنوی مولوی کو ترجیح دیتے ہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ مثنوی کو حدیقہ اور منطق الطیر سے وہی نسبت ہے جو قطرے کو گوہر سے ہے۔ سینکڑوں حقائق اسرار جو مثنوی میں بیان ہوئے ہیں، حدیقہ وغیرہ میں سرے سے ان کا پتا ہی نہیں، جو خیالات دونوں میں مشترک ہیں ان کی بعینہ یہ مثال ہے، جس طرح کسی شخص کو کسی چیز کا ایک دھندلا سا خیال آئے اور ایک شخص پر اس کی حقیقت کھل جائے، علامہ نے حدیقہ اور مثنوی کے ایک ہی موضوع پر اشعار نقل کرکے اپنے دعوی کو ثابت کیا ہے، اس نوعیت کے تقابلی مطالعے میں علامہ کو اولیت حاصل ہے۔

علامہ شبلی نے مثنوی میں اشاعرہ کے عقائد کی تردید کی نشان دہی کی ہے، ان روایتوں اور حکایتوں کا ذکر کیا ہے جو فی الواقع غلط ہیں لیکن مولانا نے ان سے بڑے بڑے نتیجے نکالے ہیں، مولانا قیاس تمثیلی سے کام لیتے ہیں، قیاس شمولی سے استدلال نہیں کرتے، استدلال تمثیلی کے لئے تخیل کی بڑی ضرورت ہے جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے، مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے وہ یہی قوت تخیل ہے، تصوف اور سلوک کے مسائل اور مسلمات عام ادراک بشری سے خارج ہیں، اس لئے جو شخص خود اس عالم میں نہ آئے وہ ان باتوں پر یقین نہیں کرسکتا، اس لئے ان مسائل کے سمجھانے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کو مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعے سے سمجھایا جائے۔

علامہ شبلی کو علم کلام سے جو خاص تعلق خاطر تھا، وہ سب پر عیاں ہے، میری ناقص رائے میں خود مثنوی کا مطالعہ اور پھر اس کے مصنف پر حضرت علامہ نے صرف اسی وجہ سے قلم اٹھایا ہے کہ وہ اسے عقائد اور علم کلام کی عمدہ ترین کتاب سمجھتے تھے، ورنہ جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ

مثنوی تصوف وسلوک کی کتاب ہے تو علامہ شبلی کو خود ان کے بہ قبول تصوف سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، حضرت علامہ نے مثنوی میں علم کلام سے متعلق مباحث پر بڑی بصیرت افروز گفتگو کی ہے، ان کا خیال ہے کہ: موجودہ علم کلام کی بنیاد امام غزالی نے قائم کی اور رازی نے اس عمارت کو عرش کمال تک پہنچا دیا، اس وقت سے آج تک سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی جا چکیں ہیں، یہ سارا دفتر ہمارے سامنے ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ مسائل عقائد جس خوبی سے مثنوی میں ثابت کئے گئے ہیں، یہ تمام دفتر اس کے آگے ہیچ ہیں، ان تصنیفات کے پڑھنے سے اس قدر ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غلط کو صحیح، دن کو رات، زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں لیکن ایک مسئلہ میں بھی یقین اور تشفی کی کیفیت نہیں پیدا کر سکتے، بہ خلاف اس کے مولانا روم جس طریقے سے استدلال کرتے ہیں، وہ دل میں اثر کر جاتا ہے اور گو وہ شک وشبہات کے تیر باراں کو کلیۃً روک نہیں سکتا، تاہم طالب حق کو اطمینان کا حصار ہاتھ آ جاتا ہے۔

ذات باری تعالیٰ، صفات باری، نبوت، معجزہ، روح، معاد، جبر وقدر، تصوف، توحید، فلسفہ و سائنس وغیرہ وہ موضوعات ہیں جن پر مولانا نے علم کلام کی روشنی میں بحث کی ہے اور جن کو حضرت علامہ نے اپنی اس کتاب میں تبصرے کے لئے منتخب کیا ہے، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ علامہ کا خاص موضوع ہے، اس لئے علامہ نے ان موضوعات پر نہایت جامع گفتگو کی ہے، ایران میں ایک معروف فلسفی تھے محمد تقی جعفری، ان کا چند سال قبل انتقال ہوا ہے، انہوں نے مثنوی مولانا کی فلسفیانہ انداز میں شرح کی ہے جو متعدد جلدوں میں "تفسیر ونقد وتحلیل مثنوی" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے، اس کے علاوہ مثنوی کے بیشتر تراجم اور شرحیں اس لحاظ سے سادہ ہیں کہ انہیں محض تصوف کی بنیاد پر لکھا گیا ہے، ہندوستان میں بحر العلوم نے جو شرح مثنوی لکھی ہے، وہ اسی انداز پر ہے جو علامہ نے اختیار کیا ہے، اس لئے علامہ شبلی نے اس شرح سے استفادہ کیا ہے اور کئی مرتبہ اپنے خیالات کی تصدیق وتائید کے لئے بحر العلوم کی شرح مثنوی سے نقل واقتباس بھی کیا ہے۔

علامہ شبلی نے "سوانح مولانا روم" میں مختلف موضوعات پر بحث کے دوران مثنوی مولوی سے متعدد اشعار نقل کئے ہیں، بعض اشعار کا اردو ترجمہ بھی دیا ہے، اس ترجمے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مثنوی کے مطالب کی روح کو سادہ زبان وانداز میں پیش کیا گیا ہے، ہندوستان میں

مثنوی مولانا روم کے متعدد اردو تراجم ملتے ہیں لیکن جو سادگی اور تسلسل علامہ شبلی کے تراجم میں نظر آتا ہے وہ دوسرے تراجم میں تقریباً مفقود ہے، مثال کے طور پر علامہ روح کے بارے میں مثنوی سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں اور اس کا اردو ترجمہ بھی خود ان کے ذہن وقلم کا نتیجہ ہے:

جان چہ باشد با خبر از خیر وشر — جان وروح کس چیز کا نام ہے، اس چیز کا جو خیر وشر کو جانتی ہے۔

شاد از احسان وگریان از ضرر — اور جو فائدے سے خوش اور نقصان سے رنجیدہ ہوتی ہے۔

چون سر وماہیت جان مخبر است — جب جان کی ماہیت ادراک ٹھہری۔

ہر کہ او آگاہ تر، با جان تر است — تو جس کو زیادہ ادراک ہے اس میں زیادہ جان ہے۔

اقتضای جان چو ای دل آگہی است — جان کا اقتضا جب ادراک ٹھہرا۔

ہر کہ آگاہ تر بود جانش قوی ست — تو جو زیادہ ادراک رکھتا ہے اس کی جان زیادہ قوی ہے۔

روح را تاثیر آگاہی بود — روح کی تاثیر ادراک ہے۔

ہر کہ ایں بیش للّٰہی بود — اس لئے جس میں یہ زیادہ ہو وہ خدائی آدمی ہے۔

حضرت علامہ نے علم کلام سے متعلق جو نکات مثنوی میں بیان ہوئے ہیں، ان پر جم کر لکھا ہے اور ان کی وضاحت وتفسیر وتشریح میں علم کلام سے اپنے تعلق خاطر کی تصدیق بہم پہنچائی ہے، وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ حتماً جدید فلسفی اور علم کلام کے ماہر بعض مسائل کو اس طرح صراحت سے بیان نہیں کر سکے جس طرح مولانا روم نے ان حضرات سے مدتوں پہلے بیان کر دیا تھا۔

حضرت علامہ نے فارسی ادب پر جو گراں قدر کتابیں سپرد قلم کی ہیں، خاص طور پر شعر العجم، ان میں حاشیے پر منابع کا ذکر مفقود ہے، بعض محققین نے اس کو علامہ پر تنقید کا موضوع بھی بنایا ہے، اس کے برخلاف "مثنوی مولانا روم" میں علامہ نے حواشی میں کہیں کہیں اپنے منابع کا ذکر کیا ہے۔

علامہ شبلی کی یہ کتاب مولانا روم کی زندگی اور آثار پر دیگر اہم اور بنیادی کتابوں کے دستیاب ہونے کے باوجود اپنے مطالب اور علامہ شبلی کے مخصوص استدلالی طرز بیان کی وجہ سے ایک خاص مقام کی حامل ہے، اسی وجہ سے اس کا مولانا کی مثنوی پر دیگر تنقیدی تحریروں سے باقاعدہ مقابلہ ومقایسہ ضروری ہے، تب ہی علامہ شبلی کی اس کوشش کی انفرادیت اور افادیت کا حقیقی علم ہو سکے گا۔

آگرہ کے قدیم صاحب طریقت علما

از:- ڈاکٹر سید اختیار جعفری ☆

ہندوستان کا سابق دار السلطنت آگرہ (یادش بخیر......اکبر آباد) علم وادب اور تصوف کا بھی عظیم مرکز رہا ہے، اردو زبان کی تشکیل وارتقا میں بھی آگرہ کا نمایاں حصہ ہے، جس دور میں کہ اردو زبان فارسی سے الگ اور منفرد شناخت قائم کررہی تھی، اس دور میں علم وادب کا مرکز آگرہ ہی تھا، اکبر آباد یا آگرہ نہ صرف مستقبل کی اردو زبان کی شیرینی، موسیقیت اور لطافت کا گہوارہ رہا بلکہ اردو شاعری کے شمالی ہند میں آغاز کا سہرا آگرہ کے ہی سر ہے، تحقیقی طور پر یہ بات ثابت شدہ ہے کہ اردو زبان کی تشکیل عہد سکندر لودھی میں شروع ہوئی جب کہ دار السلطنت آگرہ تھا، اردو زبان نے ادبی حیثیت مغلیہ عہد کے وسط اور اوائل میں اختیار کرنا شروع کی تھی، یہ دور جو ہمایوں، اکبر، سلیم جہانگیر اور شاہ جہاں پر مشتمل ہے، دراصل اردو زبان وادب کی ترویج کا دور ہے اور اس کا سلسلہ بھی آگرہ سے ہی شروع ہوا۔

اردو زبان کے سب سے پہلے باقاعدہ مصنف وادیب اور شاعر سراج الدین علی خان آرزو آگرہ ہی کے تھے، ان کے بعد اساتذۃ میں قطب الدین باطن، نیاز علی پریشان، ڈپٹی سرسید امداد علی، میر ناصر علی دہلوی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں، ان کے بعد کے دور میں اردو زبان کے خدائے سخن میر تقی میر، خدائے نظم نظیر اکبر آبادی اور ناخدائے سخن مرزا غالب کا تعلق بھی آگرہ سے ہی ہے، خان آرزو سے لے کر اس طبقۂ دوم تک آگرہ میں کم از کم تین درجن قد آور صاحب علم وقلم کے نام ملتے ہیں۔

صرف زبان وادب ہی نہیں آگرہ تعلیم وتدریس اور تصوف کا بھی اہم مرکز رہا ہے۔

☆ ۷/۱۴۷/۱۸، خیرادی ٹولہ، تاج گنج روڈ، آگرہ-۲۸۲۰۰۱۔

تیسری صدی ہجری سے ہی یہاں صاحبان تصوف یا علمائے طریقت کے تذکرے ملتے ہیں، آگرہ کی سرزمین میں سینکڑوں صوفیا اور ہزاروں علما استراحت فرما ہیں، حضرت شیخ سلیم چشتی، سیدنا امیر ابو العلا، سید عبداللہ احراری، سید فتح الدین بلخی عرف تارا شاہ چشتی صابری، میر رفیع الدین محدث اکبر آبادی، مفتی ناصر اکبر آبادی وغیرہ یہاں کے نہایت نام ور علما وصوفیا تھے، ایسے ہی چند اہل علم صوفیا کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے، انتخاب صرف صاحب علم وفضل اور ماہرین شریعت کا کیا گیا ہے۔

مفتی ابو الفتح اکبر آبادی المکی: مفتی صاحب موصوف شروان میں پیدا ہوئے، ابتدائے عمر میں ہی مکہ مکرمہ چلے گئے تھے، وہاں تقریباً ۳۸ سال قیام رہا، اسی وجہ سے مکی مشہور ہوئے، مکہ مکرمہ میں شیخ اسید الخلیفہ، ابو العباس الاخری، شیخ عبدالرحیم الاشتری، امام الحرم الشیخ عبداللہ الحفیر وغیرہم سے اصول، فقہ، تفسیر، حدیث اور ادب کی تعلیم حاصل کی، سلطان سکندر لودھی کے عہد میں ۱۴۹۷ء میں وارد سندھ ہوئے، مفتی صاحب کے علم وفضل کی شہرت سن کر بادشاہ نے اشتیاق ملاقات کا عریضہ بھیج کر آگرہ بلوایا اور ان کے ساتھ عاجزی اور محبت کے ساتھ پیش آیا، اسی کی درخواست پر انہوں نے آگرہ میں قیام کو منظور کرلیا، ان کے ساتھ بادشاہ کا غیر معمولی سلوک دیکھ کر بعض امرا ان سے رشک وحسد کرنے لگے، ایک حاسد نے ان کی تحریر کی نقل کرکے ایک خط سلطان کے دشمن کے نام بنا کر اس طرح روانہ کیا کہ وہ بادشاہ کے پاس جا پہنچا، بادشاہ نے وہ خط ان کے پاس بھیج دیا، انہوں نے کہلا بھیجا کہ ابو الفتح ایسا نالائق انسان نہیں کہ ایسی بے ہودہ تحریر سے اپنے قلم کو ملوث کرکے دل آزاری روا رکھے، انشاء اللہ اس کا ذمہ دار شخص جلد ہی کیفر کردار کو پہنچے گا، ایک ہفتہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک بدمست اونٹ نے اس شخص کا ہاتھ چبالیا، جب سلطان ابراہیم لودھی بابر کے مقابلے کے لئے پانی پت کی جانب روانہ ہوا تو دیگر علما اور مشائخ کے ہم راہ مفتی صاحب بھی اس کے ساتھ تھے لیکن راہ میں از راہ کشف ان کو علم ہوا کہ خداوند کا عتاب اس لشکر پہ ہونے والا ہے، لہذا اس سے الگ ہوکر واپس لوٹ آئے، شیر شاہ سوری بھی ان کا معتقد تھا، پورن مل والی ریاست کے حکم راں رائے سین جس نے چندیری کو غارت کرکے ہزاروں مسلمان شرفا وعلما کو تباہ کردیا اور ہزاروں خواتین کو اپنے حرم میں داخل کرلیا تھا،

۹۵۰ھ میں آپ ہی کے فتوے پر ہاتھیوں کے پیروں سے کچلوا کر ہلاک کیا گیا، ۱۳۴ برس کی عمر پائی، باختلاف روایات ۲۲ رشعبان یا ۲ رذوالحجہ ۹۵۳ھ کو آگرہ میں رحلت ہوئی، میر رفیع الدین محدث صفوی نے نماز جنازہ پڑھائی، مزار مبارک محلہ گوما ئی ماموں بھانجہ میں تھا، اب ختم ہوگیا۔

صاحب تصانیف تھے، علم کلام میں ایک عربی رسالہ ''الفوائد الکلم'' لکھا تھا، ''تفسیر بیضاوی'' کا درس دیتے ہوئے ایک کتاب اصول تفسیر میں ''تیسیر القرآن'' تصنیف کی تھی، یہ کتاب ۱۳۰ صفحات پر فارسی میں ہے جس پر سید رفیع الدین محدث اکبرآبادی نے ۲ جزء کا مقدمہ تحریر کیا تھا، ان کی دیگر کتابوں میں ''الکافی، ہدی للمتقین، العلم الانساب والافراس اور الصحابۃ الکبار'' کے نام ملتے ہیں۔(۱)

مفتی حکیم ابوالفتح: حضرت حکیم مفتی عبدالقدوس ابوالفتح تھانیسر کے باشندے تھے، والد کا نام شیخ عبدالغفور بن شیخ شرف الدین فاروقی تھا، علم منقولات میں قاضی محمد فاروقی اور معقولات میں حاجی حسن بکری سے جب کہ طب میں مولانا مولوی ابوغدہ سے کمالات کا درجہ حاصل کیا تھا، سلطان سکندر لودھی کے عہد میں تھانیسر سے براہ دہلی و پلول دارالخلافہ اکبرآباد میں وارد ہوئے، اس وقت عالم جوانی تھا، یہاں آکر اولاً میر رفیع الدین صفوی محدث اکبرآبادی سے سند حدیث حاصل کی، یہیں حکمت میں مہارت حاصل کی، حالاں کہ طبابت کو پیشہ نہیں بنایا، ۵۰ برس تک میر موصوف کے محلے میں علوم نقلی و عقلی کا درس دیتے رہے، ہزاروں لوگوں نے اکتساب علم کے درجہ کمال حاصل کیا، میاں کمال الدین حسین شیرازی، شیخ افضل محمد انصاری، قاضی ناصر اکبرآبادی، حاجی ابراہیم سرہندی اور ملا عبدالقادر بدایونی جیسے صاحبان علم و فضل ان کی ہی شاگردی میں رہ کر استادان ہفت اقلیم ہوئے، ۸ رجمادی الاول ۹۷۶ھ کو راہی فردوس بریں ہوئے، تاریخ رحلت ''موت مفتی'' سے برآمد ہوتی ہے، ان کے ایک صاحب زادے شیخ عیسیٰ کا نام ملتا ہے اور ایک کتاب ''الاختیار'' کا نام ملتا ہے لیکن اس کی کیفیت نامعلوم ہے۔(۲)

سید ابوالعلا انسان اکبرآبادی: سیدنا امیر ابوالعلا احراری نقشبندی سلسلہ ابوالعلائیہ کے بانی ہیں، وہ عہد جہاں گیری کے سربرآوردہ صوفیائے طریقت میں سے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، سیدنا ابوالعلا کے صاحب زادے حضرت ابوالقاسم سے بھی بیعت تھے،

ان کا سلسلہ نسب ۲۹ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے، نسب نامہ مادری غوث الابرار حضرت خواجہ عبیداللہ احرار تک پہنچتا ہے، ان کے جد بزرگوار امیر عبدالسلام بن امیر عبدالملک ابن امیر عبدالباسط بن امیر تقی الدین کرمانی شہنشاہ اکبر کے عہد اواخر میں اپنے وطن سمرقند سے ترک وطن کر کے مع اہل وعیال ہندوستان آئے اور دہلی کے نزدیک واقع نریلہ میں قیام کیا، یہیں ۹۹۵ھ میں ابوالعلا کی ولادت ہوئی، اکبراعظم کے اصرار پر امیر عبدالسلام نے فتح پور سیکری پہنچ کر قیام فرمایا، بعد ازاں حج کے لئے حرمین گئے اور وہیں سفر آخرت اختیار فرمایا، ابوالعلا کے والد امیر ابوالوفا بہ دستور فتح پور سیکری میں مقیم رہے، وزیر اعظم مرزا راجہ مان سنگھ کو ان سے خصوصی عقیدت ومحبت تھی، ابوالعلا کے بچپن میں ہی ان کے والد کا انتقال ہوگیا، ان کی تعلیم وتربیت ان کے نانا خواجہ فیضی بن خواجہ ابوالفیض بن خواجہ محمد عبداللہ احرار کی زیر نگرانی ہوئی، خواجہ فیضی گورنر بنگال کی طرف سے علاقہ بردوان کے ناظم مقرر تھے، ایک جنگ میں خواجہ فیضی شہید ہوئے توان کی جگہ انہیں ناظم بردوان بنادیا گیا لیکن یہ دنیوی امور سے متوحش رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شب ان کو ۳ بزرگوں نے ہدایت دی کہ عبادت وریاضت میں مشغول ہوں، اس لئے بہ مشقت تمام یہ عہدہ چھوڑا، حضرت شاہ دولت منیری (قصبہ منیر) سے اکتساب فیض کیا، حضرت علی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ نظام الدین اولیا کی غائبانہ ہدایات پر آگرہ آئے اور اپنے عم بزرگوار سید امیر عبداللہ نقشبندی سے بیعت ہوکر خرقۂ اجازت وخلافت حاصل کیا۔

سید ابوالعلا جامع کمالات بزرگ تھے، صرف رہبر وطریقت نہیں پابند شریعت بھی تھے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی سوانح حیات ''انفاس العارفین'' میں اس پر کافی روشنی ڈالی ہے، ۷۱ برس کی عمر میں بہ عارضۂ حرقت البول بہ روز شنبہ ۹ صفر المظفر ۱۰۶۱ھ کو انتقال ہوا، آگرہ بائی پاس روڈ پر ان کا مزار مرجع خلائق ہے، سید ابوالعلا کا سلسلۂ تصوف بنگلہ دیش اور سری لنکا، پاکستان تک وسیع ہے، انگلینڈ، امریکہ، پاکستان، میاں مار وغیرہ میں بھی ان کے وابستگان بڑی تعداد میں رہتے ہیں، ہندوستان میں اس سلسلے کے اہم مراکز حیدرآباد، برہان پور، رام پور، اورنگ آباد، کالپی، خیرآباد، دہلی، بنگال، داناپور (بہار)، الہ آباد، بختیار نگر (لکھنؤ)، بگڑ (جھنجھنو،

راجستھان)، الور، گوالیار اور نارنول وغیرہ ہیں۔

سیدنا امیر العلا احراری شاعر تھے، انسان تخلص کرتے تھے، ان کے اشعارِ فارسی ان کے رسالہ فنا و بقا میں دیکھے جاسکتے ہیں، ان کے علاوہ متعدد اردو اشعار بھی کہے ہیں جو اس وقت دستیاب نہیں، فارسی اشعار بہ طور نمونہ:

صیاد ازل کہ دانۂ و دام نہاد　　مرغے بگرفت و آدمش نام نہاد
ہر نیک و بدے کہ در جہاں می گزرد　　خود میکند و بہانہ بر عام نہاد
ناوک اندر کمانِ خود دارد　　شاہداں را بہانہ در ابرو
نکو گوئی نکو گفت است بالذات　　کہ التوحید اسقاط الاضافات
ایں ہمہ طمطراق کن فیکون　　ذرّہ نیست نزد اہل جنوں
دردم از یار ست و درماں نیز ہم　　دل فدائے او شد و جان نیز ہم
سررشتۂ نسب بہ علی ولی رسید　　انسآن تخلصم شدہ نامم ابو العلاءؔ

امیر ابوالعلا کی ایک کتاب "رسالہ فنا و بقا" موجود ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب تصوف کے مراحل "فنا" اور "بقا" کی تلاش، طریقہ، اللہ کی ذات کے استحضار اور مختلف باطنی معاملات کے سلسلے میں ہے، یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن اس کی قدر و قیمت اہل تصوف اور اہل علم کے نزدیک متفقہ طور پر کافی اہم ہے، اس کو پروفیسر نذیر احمد نے ایڈٹ کر کے مجلہ تحقیق پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں شائع کرادیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک دیوان شاعری کا نام ملتا ہے لیکن راقم الحروف کو اس کی زیارت نصیب نہیں ہوسکی، ان کے چند مکاتیب کا مجموعہ بھی ہے جس میں شریعت و طریقت کے مختلف مسائل پر اظہار خیال ہے۔ (۳)

شیخ بایزید: حضرت شیخ بایزید شروانی آگرہ کے اہم صوفیا میں ہیں، سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت سید ولی چرتھاولی سے بیعت تھے، آمادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، عموماً جذب طاری رہتا تھا، گریہ قلبی سے معمور رہتے تھے، دسویں صدی ہجری کے اواخر میں رحلت کی، ان کا مزار موضع سنگن نزد گنبد تخت پہلوان دیوری روڈ آگرہ پر تھا، اب نام و نشان مٹ چکا ہے۔

شیخ بایزید خوشگی: یہ عہد عالم گیری کے ایک صاحب نسبت اور واقف حقیقت

بزرگ تھے، ۱۰۹۸ھ میں راہی دار السرور ہوئے، قطعہ تاریخ وفات:

چوں گذشت از دارِ فانی بایزید　　یافت قصرِ جاودانی بایزید
سال نقلش مظہر الحق زد رقم　　شد ز آفاق آہ ثانی بایزید
۱۰۹۴ھ (۴)

اسدیار خاں انسآن اکبر آبادی: اسدیار خاں انسآن اکبر آبادی عہد محمد شاہ بادشاہ کے ممتاز شاعر ہیں، ان کا نام اسدیار خاں تھا، محمد شاہ نے انھیں اسد الدولہ کا خطاب اور ہفت ہزاری منصب مع لوازمات سے سرفراز کیا تھا، افسران شاہی میں ان کی انفرادیت قابل ذکر ہے، پورے شاہی کروفر کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، پیدائش دہلی میں ہوئی لیکن ابتدائے شباب میں ہی آگرہ آگئے تھے، عمر کا بیشتر حصہ یہیں گزارا لیکن انتقال دہلی میں ہی ہوا، فتح علی گردیزی نے لکھا ہے کہ منصبی ذمہ داریوں کے ساتھ ان کی شاعری بھی چلتی رہی، موزوں طبع تھے، تصوف کا غلبہ تھا، عموماً اسی رنگ میں کہتے تھے، ہر چند کہ امارت دروازے کی لونڈی تھی لیکن انہوں نے کبھی فخر و غرور نہیں کیا، عالم شباب میں تقریباً ۳۳ برس کی عمر میں انتقال ہوا، نمونہ کلام:

اگرچہ ہر بنِ موسے بدن سارا شب کا ہے　　نہ دیکھی ایک جھلک بھی آپ کے تن بیچ اندھوں میں
نظر بھر دیکھ مشت خاک میں کیا کیا جھمکا ہے　　زمین اور آسماں اور مہر و مہ سب تم میں ہیں انسآن (۵)

ملا ولی محمد ولی اکبر آبادی: یہ علم و فضل سے موصوف اور سید شاہ ابوالعلا احراری نقشبندی کے خلفائے اعظم اور یارانِ جاں نثار میں سے تھے جو نسبت حضرت شیخ نصیر الدین کو حضرت نظام الدین کے خلفا میں تھی، وہی نسبت ان کو خلفائے ابوالعلا میں تھی، صاحب علم و فضل، عالم باعمل، عارف باللہ، عاشق رسول اور استاد زماں تھے، میر ابوالعلا کے صاحب زادے ابوالقاسم کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے، ذاتی سوانح حاصل نہ ہوسکے، وہ استاد حدیث و ادب تھے۔ فارسی ادب میں خصوصی امتیاز حاصل تھا، مدرسہ عالیہ جامع مسجد آگرہ میں عربی و فارسی کے استاد تھے۔ ان کے زیر ادارت ایک رسالہ "الشہید" نائی کی منڈی آگرہ سے نکلتا تھا، مثنوی مولانا روم کی شرح اردو میں لکھی ہے، یہ کتاب سینٹ جانس کالج آگرہ کی سینٹرل لائبریری میں موجود ہے، غالباً ۱۰۷۰ھ میں انتقال ہوا، مزار لب سڑک پختہ محلہ بالوگنج آگرہ میں تھا، اب نام و نشان مفقود ہے، ملا ولی محمد

شاعر بھی تھے اور فارسی میں ولی تخلص کرتے تھے لیکن کلام دست یاب نہ ہو سکا۔(۶)

حوالے

(۱) مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار المعروف مشاہیر آگرہ، مطبوعہ ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ، ۱۳۳۱ھ ص ۳۳۔ مخبر الواصلین ص ۵۷۔ تذکرۂ مشاہیر ص ۹۸۔ طبقات ناصری ص ۳۴۔ تذکرہ علمائے ربانی ص ۱۰۶۔

(۲) ایضاً۔

(۳) مولانا مفتی انتظام اللہ شہابی: تذکرۂ مشاہیر اکبرآباد ص ۶

مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار ص ۱۵۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی: انفاس العارفین۔

ماہنامہ منشورہ آگرہ نمبر: جون ۱۹۳۷ء، ص ۱۴۔

مولانا شاہ محمد قاسم داناپوری: نجات قاسم ص ۴۸۔

مرزا احید الدین بیگ: اسرار ابو العلا، جدید ایڈیشن، جون ۱۹۹۶ء۔

(۴) مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار، ص ۵۳۔

(۵) میر تقی میر: نکات الشعرا، ص ۱۲۴۔

فتح علی گردیزی: تذکرۂ ریختہ گویاں، ص ۴۸۔

لالہ سری رام: خم خانۂ جاوید، جلد اول، ص ۲۶۶۔

ڈاکٹر سید اختیار جعفری: تذکرہ شعرائے اکبرآباد، جلد اول، ص ۴۸۔

(۶) مولانا سعید احمد مارہروی: بوستان اخیار، ص ۲۴۷۔

بزم صوفیہ

مرتبہ:- سید صباح الدین عبد الرحمان

صفحات: ۶۴۷ قیمت: ۱۴۰/روپے

حکیم عمر خیام

از:- پروفیسر عبد الاحد رفیق☆

حجۃ الحق حکیم ابو الفتح عمر بن خیام نیشاپوری کا شمار پانچویں صدی ہجری کے آخر اور چھٹی صدی ہجری کے شروع کے عظیم شاعروں، ریاضی دانوں، حکیموں اور فلسفیوں میں ہوتا ہے، اس کے علم و فضل کا اعتراف اہل ایران سے زیادہ اہل یورپ نے کیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خیام جیسے نامور حکیم اور شاعر کی زندگی کے بعض پہلو پورے طور پر روشن نہیں، گوکہ متعدد لوگوں نے اس کی زندگی کے حالات قلم بند کئے ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خیام ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ مطابق ۱۰۱۷ء یا ۱۰۱۹ء میں پیدا ہوا، خیام کی پیدائش کا یہ سال اس بنیاد پر لکھتے ہیں کہ نظام الملک طوسی، حسن بن صباح اور خیام تینوں ہم سبق تھے، لہٰذا تینوں ہم عمر بھی ہوں گے، نظام الملک طوسی کا سال پیدائش ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ ہے، اس لئے خیام کا سال پیدائش بھی ۴۰۸ھ یا ۴۱۰ھ ہوگا۔

خیام کے سال وفات کے متعلق بھی کوئی قطعی تاریخ نہیں ملتی، بروکلمین نے ۵۱۵ھ/ ۱۱۲۱ء لکھا ہے، دوسرے مغربی مصنفین نے ۵۱۷ھ/ ۱۱۲۳ء لکھا ہے، آزاد بلگرامی نے اپنی کتاب ''ید بیضاء'' میں ۵۱۸ھ/ ۱۱۲۴ء ثبت کیا ہے، نظامی عروضی سمرقندی اپنی کتاب ''چہار مقالہ'' میں لکھتا ہے کہ میں نے ۵۳۰ھ/ ۱۱۳۵ء میں خیام کی قبر کی زیارت کی تو مجھے معلوم ہوا کہ خیام چار سال قبل عالم فانی کو خیر باد کہہ چکا ہے، اس لحاظ سے خیام کا سال وفات ۵۲۶ھ/ ۱۱۳۱ء ہوتا ہے، خیام نے امام موفق (متوفی ۴۴۰ھ/ ۱۰۴۸ء) کی صحبت میں رہ کر قرآن مجید، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، علم ہیئت میں استاد ابو الحسن کی شاگردی میں رہا، فلسفے میں بوعلی سینا اس کے استاد

☆ اسٹیل فیبکرٹی رود۔ اپر صورہ، سری نگر

تھے جس کا خود اس نے اپنے رسالہ " کون و تکلیف " میں اعتراف کیا ہے۔

عام روایات کے مطابق خیام نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح تینوں ہم سبق اور امام موفق کے شاگرد تھے، اس سلسلے میں رشید الدین فضل اللہ اپنی کتاب جامع التواریخ میں رقم طراز ہیں:

" خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک تینوں ہم درس اور ہم سبق تھے، ایامِ طفلی میں تینوں نے یہ طے کیا کہ ہم میں سے جو بھی پہلے کسی مقام پر فائز ہوگا، دوسروں کے ساتھ رعایت کرے گا، حسن اتفاق سے نظام الملک طوسی سلجوقی دربار میں وزارت کے عہدے پر فائز ہوا اور خیام اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایامِ طفلی کا وعدہ یاد دلایا، نظام الملک نے نیشاپور اور اس کے گرد و نواح کی جاگیر اسے عطا کی لیکن خیام نہایت قانع تھا، اس نے قبول نہ کیا اور درخواست کی کہ وظیفہ کے طور پر کچھ مقرر کر دیجئے، نظام الملک نے ایک ہزار دینار ماہانہ طے کر دیا، حسن بن صباح بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے رے یا اصفہان کی جاگیریں دینا چاہا لیکن وہ اتنے کم پر راضی نہ ہوا، شاید وزارت کی توقع رکھتا تھا لیکن کامیاب نہ ہوا "۔

روضۃ الصفا، حبیب السیر اور تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی کے مصنفین نے بھی یہ واقعہ درج کیا ہے۔

بہر حال تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہے کہ خیام کو علم و فضل میں بڑی شہرت حاصل ہو چکی تھی، چنانچہ جب ملک شاہ نے ایک عظیم رصد خانہ بنوانا چاہا تو اس غرض سے ملک کے جن بڑے بڑے عالموں اور ہیئت دانوں کو بلوایا ان میں ایک خیام بھی تھا۔

ابن الاثیر لکھتا ہے زر کثیر صرف ہونے کے بعد اس رصد گاہ سے جو زیچ تیار ہوئی وہ خیام ہی کی فکر کا نتیجہ تھا۔

خیام کو آج دنیا ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ فلسفہ میں بوعلی سینا کا ہم پایہ اور مذہبی علوم میں امام فن تھا، علم نجوم کا وہ اس قدر ماہر تھا کہ بادشاہ وقت خاص خاص تقریبات کی تاریخ مقرر کرانے کے لئے اس کی طرف رجوع کرتا تھا، ایک بار ملک شاہ نے شکار

کے لئے جانا چاہا تو خیام سے کہا کہ کوئی مناسب وقت مقرر کر لے، خیام نے علم نجوم کے حساب سے ایک دن مقرر کر لیا اور بادشاہ کو خود سوار کرایا لیکن اس وقت مطلع ابر آلود ہو گیا اور بارش کے آثار نمودار ہوئے، لوگ خیام پر ہنسنے لگے تو خیام بادشاہ سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوا کہ بادل ابھی چھٹ جائیں گے اور مطلع صاف ہو جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، خیام علم طب میں بھی مہارت رکھتا تھا، جب بیہقیؔ مرتبہ شہزادہ سنجر چیچک کا مریض تھا تو اس کا علاج خیام نے کیا تھا۔

خیام ایک آزاد خیال فلسفی تھا جس کے باعث بعض مذہبی علما اسے ملحد کہتے تھے، خیام کی تصنیفات کے سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنی کتاب " خیام اور اس کے سوانح و تصانیف پر ناقدانہ نظر " میں خیام کی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔(۱)

۱- رسالہ استخراج اضلاع پر لغات و مکعبات۔(۲) ۲- رسالہ جبر و قدر۔(۳)

۳- رسالہ شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس۔ ۴- زیچ ملک شاہی۔

۵- رسالہ مختصر در طبعیات۔(۴) ۶- میزان الحکم۔(۵)

۷- رسالہ الکون و التکلیف۔(۶) ۸- رسالہ موضوع علم کلی موجود۔(۷)

۹- رسالہ فی کلیات الوجود۔ ۱۰- رسالہ اوصاف یا رسالۃ الوجود۔

۱۱- ....۔(۸) ۱۲- نوروز نامہ۔

۱۳- رباعیات عمر خیام۔ ۱۴- دیوان عربی۔

۱۵- مکاتیب خیام فارسی۔(۹) جو اب ناپید ہے۔

---

(۱) معارف: مقالہ نگار کی فہرست سید صاحب کی دی ہوئی اجمالی فہرست سے مکمل مطابق نہیں ہے اس فرق کو آگے کے حواشی میں ظاہر کر دیا گیا ہے، سید صاحب نے اس کی بعد میں مزید تفصیل بھی قلم بند کی ہے۔(۲) رسالہ استخراج اضلاع مربعات و مکعبات۔(۳) اس کا نام " جبر و مقابلہ " لکھا ہے۔(۴) اس کا ایک اور نام " لوازم الامکنہ " بھی دیا ہے۔(۵) اس کا بھی ایک اور نام " رسالۃ فی الاحتیال لمعرفۃ مقداری الذہب والفضۃ " لکھا ہے۔(۶) اس کا نام " رسالہ کون و تکلیف و رسالۂ اسئلہ ثلاثہ " تحریر کیا ہے۔(۷) غالباً موجود نقل کی غلطی ہے، سید صاحب نے " رسالہ موضوع علم کلی و وجود " لکھا ہے۔(۸) سید صاحب نے یہاں " بعض عربی اشعار " لکھا ہے۔(۹) اس کا نام اس طرح دیا ہے " مکاتیب خیام و...... (فارسی) (گم شدہ)، سید صاحب نے بعض نو دریافت رسالوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

مذکورہ کتابوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ خیام علوم پر قدرت کاملہ رکھتا ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کو شہرت ملی تو فقط اس کی چند رباعیات کے باعث جس کا سہرا اہل یورپ کے سر جاتا ہے، دراصل ان ہی لوگوں کی وجہ سے خیام رباعی گو شاعر کی حیثیت سے پوری دنیا میں مشہور ہوگیا اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں خیام کی رباعیوں کا ترجمہ ہوچکا ہے۔

شاعری: خیام کی رباعیاں تعداد کے لحاظ سے کم، عبارت کے لحاظ سے سادہ لیکن معنی کے لحاظ سے بہت بلند پایہ اور قابل توجہ ہیں، حق تو یہ ہے کہ اس نے نہایت لطیف اور حکیمانہ خیالات کو رباعیوں کے سانچے میں ڈھال کر انہیں موثر ترین انداز میں پیش کیا ہے، اس کی رباعیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کا دل بعض باتوں سے بہت متاثر تھا، ان باتوں پر اس کا دل جلتا تھا، اس نے اپنی تمام عمر ان ہی لا دوا دردوں کے علاج میں گزار دی لیکن جب اسے اپنے درد کی کوئی دوا دکھائی نہیں دیتی تو وہ ناچار اسی اندرونی دباؤ سے مجبور ہوکر اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے شعر کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔

خیام کا پہلا دلی تاثر تو وہی انسان کی نادانی اور بے خبری ہے، آفرینش کا راز اسے معلوم نہیں، دنیا کے معمے اس کے بس کے نہیں، کوئی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جارہے ہیں، زندگی کی یہ دار و گیر کیا ہے اور زندگی کی اس بھول بھلیاں میں ایسا مایوس اور ایسا دل گرفتہ کیوں بھٹکتا ہے۔

دروی کہ درد آمدن و رفتن ہست
او را نہ بدایت نہ نہایت پیدا است
کس می زند دمی درین معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن کجا است

خیام کا دوسرا غم جس کے بوجھ کے تلے اس کا دل خون ہوا جاتا ہے، یہ ہے کہ انسانی زندگی کا درخت کیوں سرسبز و شاداب نہیں ہوتا اور خشک ہوکر زمین پر گر جاتا ہے، تندرستی بیماری سے، جوانی بڑھاپے سے اور زندگی موت سے بدل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے آدمی بھی

آخر ایک مشت خاک کے سوا کچھ نہیں ہوتے:

ہر سبزہ کہ بر کنار جوئے رستہ است گویا ز لب فرشتہ خوئے رستہ است
پا بر سر سبزہ با بخواری ننہی کاں سبزہ ز خاک لالہ روئے رستہ است

انسان جو حوادث کا اسیر ہے اس کی حیثیت ایک بازیچہ سے بڑھ کر نہیں اور وہ اپنی تمام آرزوئیں اپنے دل میں لئے زیر خاک چلا جاتا ہے اور کوئی اس کو مرنے کے معمے سے واقف نہیں کرتا۔

خیام کا تیسرا تاثر وہی شکایت ہے، ظاہرداری، فریب کاری، ریاکاری، دوروئی اور جھوٹ کی، جن سے بعض پیشوایان دین کام لیتے ہیں، یہ لوگ ظاہر میں تقدس اور تقویٰ کا جال پھیلاتے ہیں اور باطن میں اپنے اغراض کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ایسے پیشوا لوگوں کی اصلاح و ہدایت کرنے کے بجائے انہیں گم راہ کرتے ہیں، اس موضوع پر اس نے کئی پر اثر رباعیاں لکھی ہیں۔

زمانے کی گردش کی شکایت، انسان کی ناکامی اور اس کے غم، اس کی بے مقداری اور ناپائیداری اور پیرانِ طریقت کی ریاکاری کے ذکر کے بعد وہ بیماری سے نجات کی تدبیریں بھی سوچتا ہے اور تمام رنج و مصیبت میں ہمیں جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے، یہ ڈھنگ ہے عیش کا، خوشی کا اور ساری اشیا سے بے نیازی کا، ہم سب پر زمانہ غم ڈالتا ہے اور ہم سب فلکِ کج رفتار کے کھلونے ہیں، گزشتہ اور آئندہ پر ہمارا بس نہیں چلتا، دنیا کو ہم اپنی مرضی کے مطابق ایک نظام کے تحت نہیں لاسکتے، حادثات کو اپنا مطیع نہیں بنا سکتے، اس لئے ہمارے لئے سب سے بہتر یہی ہے کہ ہم گزشتہ کا رنج اور آئندہ کا غم نہ کھائیں، ہر لمحہ کو غنیمت سمجھیں اور خوش رہیں، فرصت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور اس مختصر سی زندگی کے زمانے میں جو چند سال سے زیادہ نہیں اپنی دلی تمناؤں کو پورا کریں، زندگی کے کاموں پر کمربستہ ہوجائیں، زندگی کے حوادث کا شکار نہ بنیں، ہر دم زندگی کی قدر پہچانیں اور اس کی مصیبتوں کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔

برخیز و مخور غم جہان گذران
خوش باش و دمے بہ شادمانی گذران
در طبع جہان اگر وفائی بودے
نوبت بتو خود نیامدے از دگران

آزاد خیالی کے باوجود خیام توبہ و استغفار اور رقت انگیز طریقہ کو چھوڑ کر استدلال کا طریقہ جو اختیار کرتا ہے وہ بہ ظاہر ایسا قوی ہوتا ہے کہ گویا اس کا جواب نہیں ہوسکتا۔

برسینۂ غم پذیر من رحمت کن ‌ ‌ برحالِ دلِ اسیرِ من رحمت کن

برپائے خرابات روِ من بخشاء ‌ ‌ بر دست پیالہ گیرِ من رحمت کن

مغفرت کی دعا مانگتا ہے لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے، یعنی ہاتھ اور پاؤں کے لئے، گواہ اسی کے ہاتھ پاؤں ہیں، اس طریقہ سے دعا کا اثر بڑھاتا ہے، کیوں کہ اپنے لئے دعا مانگنا پھر بھی ایک قسم کی ذاتی غرض ہے، اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی ہے کہ اعضا کی برأت آسانی سے ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ ان کا کیا قصور ہے؟ وہ اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرسکتے۔

در ملک تو از طاعت من ہیچ فزود

و ز معصیتے کہ رفت نقصانے بود

بگذار و مگیر زاں کہ معلوم شد

گیرندۂ دیری و گزارندۂ زود

خیام خدا سے خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں نے اطاعت کی تو کیا تیری سلطنت کو کچھ ترقی ہوگی؟ اور اگر گناہ کیا تو کیا کچھ تیرا نقصان ہوگیا، اے خدا مجھ کو چھوڑ دے اور گرفت نہ کر مجھ کو معلوم ہوگیا ہے کہ تو دیر کے بعد پکڑتا ہے اور جلد چھوڑ دیتا ہے۔

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجا است

تاریک دلم نور صفائے تو کجا است

مارا تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی

ایں مزد بود لطف و عطای تو کجا است

کس شاعرانہ انداز سے مغفرت کرنے پر متوجہ کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ اے خدا اگر تو بہشت طاعت کے معاوضہ میں دے گا تو یہ تو خرید و فروخت ٹھہری جو سوداگروں کا کام ہے نہ کہ بادشاہوں کا، وہ لطف و عطا جس کے قصے سنا کرتے تھے وہ کہاں ہے۔

خیام کا فلسفۂ زندگی بہ ظاہر اپیکورس کی آواز بازگشت ہے یعنی یہ کہ گزشتہ اور آئندہ سے

کچھ بحث نہیں جو کچھ ہے حال ہے، اس میں کھاؤ۔ پیو۔ خوش رہو۔

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت

در پردۂ اسرار فنا خواہی رفت

مے نوش ندانی از کجا آمدۂ

خوش باش ندانی کہ کجا خواہی رفت

روزے کہ گزشتہ است از و یاد مکن

کہ فردا کہ نیامدہ است از و یاد مکن

بر نامدہ و گزشتہ بنیاد مکن

حالے خوش باش و غم یاد مکن

یہ فلسفہ کہ انسان نیکی اور بدی کا کچھ خیال نہ رکھے، جو جی میں آئے کرے، مزے اڑائے، بہ ظاہر نہایت خطرناک ہے لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہوسکتی، اس نے بہت سی رباعیوں میں معاد اور سزا کا اقرار کیا ہے اور نکوکاری اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔

غیبت مکن و دل کساں را مازار

در عہدۂ آں جہاں منم بادہ بیار

بد خواہ کساں ہیچ بہ مقصد نہ رسد

یک بد نہ کند تا بہ خودش صد نہ رسد

مطلب یہ ہے کہ اس پر عذاب یا ثواب ہوگا، یا خدا اس کو بخش دے گا تو پھر ان کو کچھ پروا نہ ہوگی، خیام کسی کام کے کرنے کے وقت صرف یہ دیکھتا ہے کہ خود یہ کام کیسا ہے؟ اگر کام برا ہے تو اس سے کچھ تسلی نہیں ہوتی کہ خدا اس کو بخش دے گا، اس کے نزدیک یہی بڑا عذاب ہے کہ خدا دیکھ رہا تھا اور اس نے جرم کا ارتکاب کیا۔

بانفس ہمیشہ در نبردم چہ کنم

و ز کردۂ خویشتن بہ دردم چہ کنم

گیرم کہ ز من در گزرانی بہ کرم

زین شرم کہ دیدی کہ چہ کردم چہ کنم

یعنی اے خدا اس نے مان لیا کہ میرا گناہ معاف کردے گا اور عذاب نہ دے گا لیکن یہ کیا کم عذاب ہے کہ تیری نظر کے سامنے میں نے ایسا فعل کیا۔

خیام نے گو شاعری کے پردہ میں دل کے پھپولے توڑے لیکن افسوس ہے کہ فقہا کی سخت گیری کی وجہ سے وہ کبھی اسرار و حقائق کے ظاہر کرنے کی جرأت نہ کرسکا، چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست

گفتن نتواں زاں کہ وبالِ سرِ ماست

چوں نیست دریں مردم ناداں اہلے

گفتن نتواں ہر آنچہ در خاطرِ ماست

خیام کی اخلاقی تعلیم میں ریاکاری سب سے بڑا جرم ہے اور اس نے جس خوبی سے اس کی پردہ دری کی ہے، آج تک کسی نے نہیں کی ہے۔

زاہدے بہ زنے فاحشہ گفتا مستی

بنگر ز کہ بگسستی و چوں پیوستی

زن گفت چناں کہ می نمایم ہستم

تو نیز چنانکہ می نمائی ہستی

ایک زاہد نے ایک فاحشہ عورت سے کہا کہ تو بدمست ہے تو خیال یہی کرتی کہ تو نے کس چیز کو چھوڑا اور کس چیز کو اختیار کیا ہے، اس نے جواب دیا کہ میں تو جیسا اپنے آپ کو ظاہر میں بتلاتی ہوں ویسی ہی ہوں بھی، کیا آپ بھی اپنے آپ کو جیسا دکھلاتے ہیں ویسے ہی ہیں؟

خیام نے اس بات پر بھی خوب غور کیا تھا کہ کن کن اسباب سے انسان کو خواہ مخواہ ہی ریا میں گرفتار ہونا پڑتا ہے، اس لئے وہ ان موقعوں سے بچنے کی تعلیم دیتا ہے۔

در راہ چناں رو کہ سلامت نہ کنند

باخلق چناں زی کہ قیامت نہ کنند

در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا

در پیش نہ خواہند و امامت نہ کنند

یعنی راستہ میں اس طرح چلو کہ کوئی تم کو سلام نہ کرے، لوگوں کے ساتھ اس طرح بسر کرو کہ لوگ تمہاری تعظیم کے لئے قیام نہ کریں، مسجد میں جاؤ تو اس طرح کہ لوگ تم سے امام بننے کی خواہش ظاہر نہ کریں۔

خیام کا فلسفۂ اخلاق زہاد اور علما کے فلسفۂ اخلاق سے نہایت بلند ہے، یہ مقدس گروہ کسی کام کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ لوگ کیا خیال کریں گے اور کہیں گے۔

یہ عجیب بات ہے کہ خیام کی قدردانی ایشیا سے زیادہ یورپ نے کی اور کرنی چاہئے تھی۔

کتابیات

۱- تذکرہ دولت شاہ سمرقندی۔

۲- چہار مقالہ، نظامی عروضی۔

۳- شعر العجم، حصہ اول، از مولانا شبلیؒ۔

۴- تاریخ ادبیات ایران براؤن، حصہ دوم۔

۵- تاریخ ادبیات ایران، از رضا زادہ شفق۔

۶- تاریخ ادبیات ایران، از صفا۔

۷- خیام، از سید سلیمان ندویؒ۔

۸- چکیدہ ادبیات ایران (حصہ شعر)۔

۹- تاریخ ادبیات ایران، جلال الدین صبائی سنا۔

۱۰- سخن و سخن وران، بدیع الزماں۔

۱۱- تاریخ نظم و نثر، استاد نفیسی۔

۱۲- تاریخ ادبیات ایران، از ڈاکٹر محمد صدیق خاں مطبوعہ لاہور۔

اخبار علمیہ

کرغستان کا صوبائی تاریخی میوزیم سنٹرل ایشیا کا عظیم میوزیم سمجھا جاتا ہے، یہ جمہوریہ کرغز کے صدر مقام بشکک میں واقع ہے، اس کے متنوع کلکشن اس ملک کی روشن تاریخ کا نمونہ پیش کرتے ہیں، ۱۹۲۷ء میں اس میوزیم کا آغاز ہوا تھا، اس میں کرغستان کی تاریخ وثقافت سے متعلق آثار قدیمہ کے تقریباً ۸ ہزار نمونے موجود ہیں جس سے سوویت عہد میں کرغستان کی تہذیبی، سائنسی اور اقتصادی برتری کا اندازا ہوتا ہے، تصویریں، دست کاری اور سنگ تراشی سے متعلق مصنوعات، روایتی پارچہ بافی کے ملبوسات اور قدیم سکوں سے دور حاضر تک کے کاغذی روپیوں کے نمونے اس میوزیم کی شان میں اضافہ کررہے ہیں، اس کی بعض نادر اور قیمتی اشیا نمائش کے لئے ملک سے باہر جیسے فرانس، فن لینڈ، جاپان، ترکی، ماسکو، سینٹ پیٹرس برگ وغیرہ بھی اکثر بھیجی جاتی ہیں، میوزیم کی سب سے زیادہ پرکشش اور خاص چیز اس کی سنگ تراشی کے نمونے ہیں جو چھ سے دس صدی پہلے کے ہیں اور ان میں سے اکثر کیمن، غوئی میں آئی سیکول اور نیرن کے علاقوں میں پائے گئے تھے اور سنٹرل ایشیا کے دوسرے علاقوں اور منگولیا اور الٹائی وغیرہ میں پائی جانے والی اشیا کے مشابہ ہیں، ان کے ملاحظہ ومطالعہ سے خانہ بہ دوش ترک خانوادوں کے نسلی خصائص، آرائشی طریقوں، ملبوسات اور دوسری صنعتوں کے بارے میں واقفیت میں بڑی مدد مل سکتی ہے، بشکک میں دوسرے میوزیم بھی ہیں جیسے اسٹیٹ میوزیم آف فائن آرٹس تا کوئکل میوزیم آف لٹریچر اینڈ آرٹ، مائنریلوجی میوزیم، میوزیم آف دی اکیڈمی آف آرٹ وغیرہ۔

(نیوز لیٹر انگریزی)

گزشتہ چند برسوں میں خلیجی ممالک میں ایسے سرمایہ کاری کرنے والے بینک اور کمپنیاں وجود میں آئی ہیں جن کا نظم ونسق اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے، مسلمانوں کی دل چسپیاں اس میدان میں بھی بڑھ رہی ہیں، علم الاقتصادیات کے تئیں طلبہ کے اسی رجحان اور متخصصین کی بڑھتی ہوئی

تعداد کے پیش نظر کویت میں پہلی اقتصادی یونی ورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، عالمی سرمایہ کاری گروپ کے چیرمین سلمان الداؤد الصباح نے جدید تعلیم سے آراستہ شخصیات پر مشتمل ایک ایسی کمیٹی بھی بنائی ہے جو عالمی سطح پر اسلامی سرمایہ کاری کے بازار میں پیش آنے والی ضرورتوں کی تکمیل میں معاون ہوگی۔

اسپین کے نومبر، دسمبر کے شمارے میں امریکن لائبریری دہلی کے قیام ومقاصد پر مشتمل ایک تعارف شائع ہوا ہے، یہ لائبریری ۶۰ برس قبل چھوٹے سے ریڈنگ روم میں جن پتھ پر شروع کی گئی تھی، ۱۹۷۴ء میں اسے امریکن سنٹر کی بلڈنگ میں منتقل کیا گیا، پچھلی دو دہائیوں میں اس نے اس قدر ترقی کی کہ وہ مکمل طور پر خودکفیل اور جدید ترین سہولتوں سے بھی آراستہ ہوگئی ہے، چنانچہ آن لائن ڈیٹا بیس اور سی ڈی روم پر اطلاعات بھی دست یاب ہیں اور جدید ترین موضوعات پر یہاں کتابیں بھی مہیا ہیں، قانون، کمپیوٹر، مینجمنٹ، تجارت، بین الاقوامی تعلقات، امریکن ادب وامور مملکت سے متعلق موضوعات پر ۱۶ ہزار کتابیں اور ۱۵۰ مطبوعہ جرائد موجود ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کے کارکن علم وتعلیم سے محروم اور نادار نوجوانوں کو ہمہ وقت سہولت بہم پہنچاتے ہیں اور لائبریری کے ذمہ دار اکثر اسکولوں اور یونی ورسٹیوں کا دورہ بھی کرتے ہیں، نیز لائبریری اسٹاف استفادہ کرنے والوں کو ان کی تحقیق کے مخصوص موضوعات پر مضامین اور کتابوں کی فہرست فراہم کرنے میں پوری معاونت کرتا ہے۔

کویت کی وزارت اوقاف کی زیرسرپرستی کام کرنے والا ادارہ ''حج ہاؤس'' جو زکوۃ کی تحصیل وتقسیم کا انتظام بھی کرتا ہے، ادارے کی تمام سرگرمیاں اور منصوبے اس کی ویب سائٹ www.Zakathous.Org.kw پر دیکھی جاسکتی ہیں جس کے aboutus نامی ہوم پیج پر اس کے مختلف شعبے، منصوبے اور اس کے قیام وغیرہ کی تمام تفصیلات موجود ہیں، اسی ہوم پیج ہی پر اس ادارے کے سائنسی مرکز آڈیو اور ریڈیو کلپس اور بچوں سے متعلق معلومات وغیرہ فراہم ہیں، ویب سائٹ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہے، تاہم بعض معلومات مثلاً سائنسی مراکز صرف عربی زبان میں ہیں، خواہش مند حضرات اس کے آن لائن ممبر بھی بن سکتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں کویت پر عراقی حملے کے سبب تیل کے کنویں، پائپ لائنیں اور بارودی سرنگیں

پاش پاش ہوگئی تھیں اور ماحولیاتی نظام بڑے پیمانے پر تہ وبالا ہوگئے تھے، اب جابر الکویت ریف پروجیکٹ ماحولیاتی آلودگی سے نجات حاصل کرنے اور اس ملک کی قدرتی خوب صورتی کو برقرار رکھنے کے لئے تیار کیا گیا ہے، اس کو سلطان کویت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس میں ان کا سب سے بڑا تعاون ہونے کی بنا پر کویت کی دوسری اہم اور بڑی شخصیتوں نے بھی اس میں دست تعاون بڑھایا ہے، یہ پروجیکٹ KDT کے ہاتھ میں ہے جو ملک کے ماحولیاتی نظام کے تحفظ پر کام کرتی ہے اور اس میں ۱۳۰-افراد شامل ہیں۔

یورپی خلائی ایجنسی نے دنیا کی سب سے بڑی دوربین بنانے کا فیصلہ کیا ہے، کیمبرج یونی ورسٹی کے ماہرین کے خیال میں مستقبل میں خلائی سائنسی ترقیات کے مدنظر ایسی دوربین تیار کرنا ضروری ہوگیا ہے، اس پروجیکٹ پر انتہائی انہماک سے ۳ برس مسلسل کام کرنا پڑے گا، ۸۰ کروڑ ''یورو'' اس کی تکمیل میں لگ سکتے ہیں، یہ دوربین اس وقت ۱۰-ایم کیک اور ۸،۲ ویلٹی جیسے جدید ترین دوربینوں سے سوگنا زیادہ تیز ہوگا، اس سے کائنات اور خلا سے متعلق متعدد حقائق سامنے آئیں گے اور زمین جیسے اور سیاروں کی موجودگی کا راز بھی فاش ہوگا، اس کا نچلا حصہ ۴۲ میٹر اور اوپری حصہ ۸۰ میٹر کے حجم میں ہوگا اور دونوں سرے گھومتے ہوئے ہوں گے۔

برطانیہ کے سائنس دانوں کی تحقیق کے مطابق رنگ انسانی زندگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں، اس پر تحقیق کرکے کسی بھی شخص کے مزاج کے بارے میں معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں، رپورٹ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ دنیا کے جس قدر رنگ مشاہدے میں ہیں اس سے کہیں زیادہ آنکھوں سے اوجھل ہیں اور اس کی لاکھوں اقسام ہیں، ماہرین کے خیال میں سرخ رنگ کے پسند کرنے والے جوشیلے، گرم مزاج، شوخ طبع ہوتے ہیں اور سیاہ رنگ پسند کرنے والے خاموش طبع، نرم مزاج مگر کسی حد تک متکبر ہوتے ہیں، سفید رنگ پاک طبع، سنجیدہ، متین اور قانع لوگوں کی پسند ہے، اسی طرح سبز، نارنجی، گلابی، بجامنی، سرمئی، مٹیالا، پیلا، نیلا اور خاکی رنگوں کے پسند کرنے والوں کے متعلق ماہرین کی تحقیقات بھی درج کی گئی ہیں۔

ک، ص، اصلاحی

معارف کی ڈاک

علی گڑھ میں دانش کدۂ نذیر پر حاضری

کاشانۂ ادب سکلا دیوراج،
ڈاک خانہ بسوریا دایا لوریا،
مغربی چمپارن (بہار)

مکرمی!

السلام علیکم

جب سے میرے دونوں بیٹے علی گڑھ میں مستقل طور پر رہنے لگے ہیں، میں ہر سال وہاں کا سفر ضرور کرتا ہوں، اس سال بھی گیا تو ۱۳رتمبر ۲۰۰۶ء سے ۲راکتوبر ۲۰۰۶ء تک وہاں قیام پذیر رہا، علی گڑھ کے ارباب فکر ونظر میں یوں تو کئی حضرات سے میری یاد اللہ ہے لیکن پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین احمد آرزو اور ڈاکٹر سید امین اشرف سے گہرے مراسم ہیں، ان حضرات سے ملاقات کے لئے ان کے یہاں ضرور حاضر ہوتا ہوں، یہ لوگ بھی مجھ سے بڑے مہر وتلطف سے پیش آتے ہیں۔

اس سال ۲۷رتمبر ۲۰۰۶ء کو دس بجے دن میں پروفیسر نذیر احمد مدظلہ سے ملاقات کے لئے ان کے دانش کدے پر پہنچا تو وہاں پہلے سے ان کے شاگرد رشید پروفیسر کبیر احمد جائسی موجود تھے، ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی، ۵ منٹ کے بعد جب وہ رخصت ہوگئے تو لگ بھگ ۴۵ منٹ تک مجھے ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کا شرف حاصل رہا، ڈاکٹر صاحب کی عمر ۹۱ سال ہوگئی ہے، اس عمر میں عموماً آدمی کسی کام کے لائق نہیں رہتا، جب تک توانائی رہی وہ تمام معمولات

زندگی بہ طریق احسن انجام دیتے رہے، پابندی سے مسجد پہنچ کر جماعت سے نماز پنج گانہ ادا کرنا اور تین پارے قرآن مجید کی تلاوت کرنا، ان کے روزانہ کا معمول رہا، علمی و تحقیقی کاموں میں ایک جوان کی طرح وہ منہمک رہے، بہ قول پروفیسر کبیر احمد جائسی ''جیسے جیسے ڈاکٹر صاحب کی عمر بڑھتی گئی، ان کا قلم اور تیز رفتار ہوتا گیا'' لیکن اب تو وہ مجبور ہو چکے ہیں، لکھنے کا کام تقریباً موقوف ہو چکا ہے، بینائی کی کم زوری کے باعث پڑھنے میں دقت محسوس کرتے ہیں، جب سے ان کی دوسری رفیقۂ حیات محترمہ آصفہ احمد صاحبہ کا انتقال ہوا ہے، ڈاکٹر صاحب کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہیں، حافظہ کم زور ہو گیا ہے، باتیں کرتے کرتے کبھی کوئی بے ربط بات بھی کہہ جاتے ہیں، یہ ناچیز جب ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے نہایت ہی پرسوز اور دردآمیز لہجے میں فرمایا:

''میں آپ کی صحت کے لئے دعا کرتا ہوں، آپ بھی میرے لئے دعا کیجئے گا''۔

پروفیسر نذیر احمد مدظلہ اسلامی وضع قطع، شریعت کی اتباع، خلوص وللہیت اور دینی غیرت و حمیت میں نمونۂ اسلاف ہیں، ان کو اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں پوری دست رس حاصل ہے، عربی اور ہندی میں بھی اچھی استعداد ہے، مستقل تصنیفات وتالیفات کے علاوہ اردو، فارسی اور انگریزی میں ایک ہزار سے زیادہ علمی و تحقیقی مضامین سپرد قلم کرکے انہوں نے علمی دنیا میں اپنا نقش و اعتبار اس طرح جمادیا ہے کہ ہندوستان و پاکستان ہی نہیں بلکہ علمائے ایران وافغانستان اور مستشرقین بھی ڈاکٹر صاحب کے علمی و تحقیقی کارناموں کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں اور قاضی عبدالودود جیسے سخت گیر محقق نے بھی ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کاوشوں کی کھلے دل سے تعریف کی ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب جیسا فارسی زبان وادب کا عالم اور بالغ نظر محقق ہندوستان، پاکستان اور ایران وافغانستان میں مشکل سے ملے گا، وہ بہت خوب صورت فارسی لکھتے ہیں مگر اپنے تمام تر علمی کمالات کے باوصف ان میں علمی پندار وغرور نہیں۔ بڑے بے نفس اور بے نیاز انسان ہیں، ان کی اجازت کے بغیر ان کے مقالات کو پاکستان اور خود ہندوستان کے کچھ ناشرین شائع کرکے مالی منفعت حاصل کررہے ہیں۔

اہل علم کو یہ جان کر تعجب ہوگا کہ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب اپنے مضامین اپنے پاس محفوظ کرکے نہیں رکھتے، جب کسی پرانے مضمون کی ضرورت پڑتی ہے تو اسے ان کے پرانے دوست پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کبھی اپنے ذخیرۂ کتب سے ڈھونڈ کر اور کبھی دوسری جگہ سے منگوا کر ان کے حوالے کرتے ہیں، تقریباً دو سال پہلے ایک بار ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے مجھ سے فرمایا:

''اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ میں نے کن کن موضوعات پر کیا کیا لکھا ہے؟ ایک بار ایک موضوع پر کچھ لکھنے کا خیال ہوا، اس موضوع پر قلم اٹھانا چاہا اور یہ بات پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کو معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا: ''اس موضوع پر تو آپ پہلے مقالہ تحریر کرچکے ہیں''، وہ مقالہ حاصل کرکے دیکھا تو اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی''۔

ایک روز شیخ سعدی شیرازیؒ (۱۱۸۴ء-۱۲۹۱ء) کا ذکر آیا تو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے فرمایا:

''شیخ سعدی ایک عظیم شاعر اور بلند پایہ نثر نگار تھے، بوستاں اور گلستاں جیسی عدیم المثال کتابیں تصنیف کیں اور اپنے عصر کے امرا، رؤسا اور سلاطین پر مبالغہ آمیز قصائد لکھے لیکن اپنے عصر کے ممتاز علما کو انہوں نے نظر انداز کیا، حالانکہ ان کے ہم عصر علما میں بڑے بڑے اصحاب فضل وکمال موجود تھے، سعدیؒ ان کے احوال وآثار پر بہت کچھ لکھ سکتے تھے اور یہ ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہوتا لیکن اس کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی''۔[1]

راقم نے شیخ سعدیؒ کے ہندوستان آنے کے بارے میں دریافت کیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

''شیخ سعدی کا ہندوستان آنا مستند تاریخ سے ثابت نہیں، ''بوستاں'' میں سعدی نے سومناتھ کے مندر میں آنے کا جو واقعہ منظوم کیا ہے اور جس کا آغاز اس شعر:

بتے دیدم از عاج در سومنات   مرصع چوں در جاہلیت منات

سے ہوتا ہے، اس نظم کی تاریخی حیثیت ایک من گڑھت افسانے سے زیادہ نہیں''۔

۱؎ یہ بات ایک بار مجھ سے بھی فرمائی تھی۔ ''ض''۔

ایک روز میر تقی میر (۱۷۲۳ء-۱۸۱۰ء) کے تذکرۂ نکات الشعرا پر بات ہونے لگی تو فرمایا:

"میر تقی میر اردو کے ایک عظیم شاعر ہیں، اس میں دو رائے نہیں، تذکرۂ نکات الشعرا کی تاریخی حیثیت جو بھی ہو لیکن اس کتاب کی "فارسی نثر" بہت گھٹیا ہے، میر تقی میر کو عمدہ فارسی لکھنا نہیں آتا"۔

ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا نظریہ ہے کہ اصحاب علم کو ان ہی علوم وفنون کے مسائل پر اظہار خیال کرنا چاہئے جن میں ان کو مہارت اور اختصاص حاصل ہے، جن علوم وفنون میں مہارت و اختصاص نہ ہو ان کے مسائل پر گفتگو کرنا اور کوئی رائے قائم کرنا شیوۂ اہل علم نہیں، چنانچہ ایک ملاقات میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"علی گڑھ کے ایک صاحب علم کے یہاں ایک تقریب تھی، اس میں یونی ورسٹی کے ارباب علم مدعو تھے، میں بھی اس میں شرکت کے لئے پہنچا، صاحب خانہ، مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) کی تفسیر "بیان القرآن" پر اظہار خیال کر رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ مولانا تھانویؒ کی یہ تفسیر اردو زبان کی کوئی اچھی تفسیر نہیں ہے، اس وقت جو اصحاب علم موجود تھے سب صاحب خانہ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے، مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے پوچھا: آپ حضرات میں سے کتنے لوگوں نے علم تفسیر کا درس لیا ہے، سب کی طرف سے نفی میں جواب ملا، میں نے عرض کیا: جس علم وفن سے آدمی واقف نہ ہو اس علم وفن کی امہات کتب پر اظہار خیال یا موازنہ اہل علم کا شیوہ نہیں، یہ کہنا تھا کہ سب حضرات خاموش ہو گئے اور گفتگو کا موضوع ہی بدل گیا"۔

اپنے گراں قدر علمی وتحقیقی کارناموں کی وجہ سے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، ملک و بیرون ملک کے دینی اور عصری علوم کے علما اور اہل علم میں یکساں طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (۱۹۱۳ء-۱۹۹۹ء) سے ڈاکٹر صاحب کے مخلصانہ اور گہرے مراسم تھے، اس کا ذکر ڈاکٹر صاحب نے اس ناچیز سے بارہا کیا ہے، علی میاں صاحبؒ نے تاریخ دعوت وعزیمت میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا حوالہ بھی دیا ہے جو علی میاں صاحبؒ کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کی عظمت علم کا محکم اعتراف ہے، دبستان شبلی کے اصحاب فکر ونظر، ڈاکٹر صاحب

کے علمی وتحقیقی کارناموں کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہیں، دارالمصنفین کے علمی ترجمان "معارف" کی مجلس ادارت کا ڈاکٹر صاحب معزز رکن ہیں، یہ اعزاز اب تک ان بالغ نظر علما کو حاصل رہا ہے جو علم اور عمل دونوں میں ممتاز ہوں، ڈاکٹر صاحب کی علمی وتحقیقی خدمات پر ملک وبیرون ملک کے مختلف اداروں، انجمنوں اور دانش گاہوں نے ان کو گراں قدر اعزازات وانعامات عطا کئے ہیں اور حکومت ہند نے ۱۹۸۷ء میں آپ کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازا اور اس سے پہلے انہیں فارسی میں مسلمہ قابلیت کا صدارتی ایوارڈ بھی ملا تھا۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب رقم طراز ہیں:

"پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد فارسی کے مستند عالم، مایہ ناز مصنف اور مشہور محقق ہیں، ہندوستان ہو یا پاکستان، ایران ہو یا امریکا، ان کی علمی تحریریں ہر جگہ بڑے ذوق وشوق اور دل چسپی سے پڑھی جاتی ہیں اور علم کے شائقین ان سے برابر مستفید ہوتے رہتے ہیں، وہ گزشتہ پچاس سال سے برابر اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھتے رہے ہیں اور ان کی تصانیف ومقالات ہر دور میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں"۔ (۱۹۸۷) [کارنامۂ نذیر، ص ۲۶-۶۷]

بلاشبہ ڈاکٹر نذیر احمد نام ہے اس نابغۂ روزگار علمی شخصیت کا جو دنیا و مافیہا سے یک سر بے خبر و بے نیاز رہ کر گیسوے علم کے سنوارنے اور بحر تحقیق کی غواصی میں ہمہ تن مصروف ومنہمک رہ کر گوہر نایاب نکالتی رہی ہے، ڈاکٹر صاحب کی زندگی حضرت جگر مرادآبادی مرحوم کے اس شعر:

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
ترے ذکر سے، تری فکر سے، تری یاد سے، ترے نام سے

اے اللہ! تو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کو تا دیر زندہ رکھ اور ان کے جسم میں نئی توانائی عطا کر کے ان کو پھر سے علمی وتحقیقی خدمات انجام دینے کے لائق بنا دے، تو اس پر قادر ہے، تو چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔

والسلام
وارث ریاضی

وفیات

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

از:- جناب فیروز الدین احمد فریدی ☆

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے، وہ ۲۳ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو جبل پور مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے اور ۹۳ برس بعد ۲۵ر ستمبر ۲۰۰۵ء کو اس منزل کی جانب روانہ ہوگئے جہاں سب کو ایک نہ ایک روز جانا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تین برس کی عمر میں پکے نمازی تھے اور قرآن ختم کر چکے تھے، اپنی ۴۲ برس پہلے لکھی ہوئی کتاب "تاریخ اسلاف" میں انہوں نے لکھا ہے کہ مجھے بچپن سے مسلسل بخار رہا کرتا تھا، گھر میں پیسے کی تنگی تھی، علاج نہیں ہو پا رہا تھا، ایک دن والدہ نے کہا کہ بیٹا! تم قرآن پڑھو، اللہ نے چاہا تو اچھے ہو جاؤ گے، بڑے بھائی نے پہلا پارہ پڑھایا، اس کے بعد میں ہر روز ربع پارہ خود ہی پڑھتا رہا، ایسی برکت ہوئی کہ چند دنوں میں ٹھیک بھی ہو گیا اور قرآن پاک بھی مکمل ہو گیا، ایک دن بیمار والد نے نماز کی ترکیب لکھا دی، ان کی دعا ایسی لگی کہ میں کسی کے کہے نے بغیر نماز پڑھنے لگا، شاید تین سال کا ہوں گا کہ نماز اور قرآن سے اس تعلق کی وجہ سے میرے چھوٹے چچا نے میرا نام ملاجی رکھ دیا اور محلے والے بھی مجھے اسی نام سے پکارنے لگے، پھر یہ ہوا کہ حصولِ تعلیم کے اسی شوق میں ایک دن میں خود ہی اسکول میں داخلہ لینے چلا گیا، وہاں کے استاد مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

اس تین سالہ ملاجی نے جو داخلے کے لئے خود ہی اسکول پہنچ گیا تھا، بعد میں علی گڑھ یونی ورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے۔ ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کیا، ناگپور یونی ورسٹی نے انہیں "ڈی لٹ" کی اعزازی سند دی جس کی ایک وجہ ڈاکٹر صاحب کی اچھوتی تحقیق "فارسی پر اردو کا اثر"

☆ کٹھوال ہاؤس ۵۴-اے، اسٹریٹ نمبر ۱۵-گلشن فیصل باتھ آئی لینڈ، کراچی۔

تھی، سندھ یونی ورسٹی نے انہیں تاحیات پروفیسر امریطس کے منصب پر فائز کیا، اردو پر فارسی کے اثر کا ذکر تو سب نے سنا ہے لیکن یہ خیال ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے ذہن رسا کو ہی آیا کہ فارسی پر اردو کا اثر ایک مکمل تحقیق طلب موضوع ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ورثے میں تقریباً ایک سو کتابیں اور کئی سو عالم چھوڑے جو ان کے طالب علم رہے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، ان کتابوں میں "اقبال اور قرآن" شامل ہے جس پر انہیں حکومت پاکستان سے لے کر مختلف ممتاز اداروں اور انجمنوں نے متعدد اعزازات دیئے جو ڈاکٹر صاحب کو ملنے پر زیادہ معتبر ہوگئے، ان کے سیکڑوں طلبا میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے جج اور چیف الیکشن کمشنر نعیم الدین اور پاکستان کے نامی گرامی ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ابن انشا شامل ہیں۔

علم، معلمی، ادب، تحقیق اور اعزازات اپنی جگہ لیکن جس آب حیات نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کو امر کر دیا وہ ان کی فاتح زمانہ روحانی شخصیت تھی، یہ ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، پروفیسر امریطس اور ڈی لٹ فردِ فرید پاکستان کے ضلع بہاول پور کے ایک غیر معروف قصبے "خیر پور ٹامی والی" کے ایک بزرگ زوّار حسین شاہ صاحب کا مرید اور خلیفہ تھا، بھلا سوچئے کہاں علی گڑھ؟ ناگپور؟ حیدر آباد (سندھ)؟ کراچی؟ اور کہاں خیر پور ٹامی والی؟ خدا کی باتیں خدا ہی جانتا ہے، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات دس برس پہلے، ۱۲ر ربیع الاول ۱۴۱۶ھ بمطابق ۱۰ر اگست ۱۹۹۵ء کو حیدر آباد (سندھ) میں ان کے گھر پر ہوئی، ملاقات کا ظاہری سبب میرا وہ کتابچہ بنا جو میں نے چند ماہ قبل "فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی ایک جھلک" کے عنوان سے لکھا تھا، ڈاکٹر صاحب صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھے تھے، ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں، انہوں نے کتابچے پر بابا فریدؒ کا نام پڑھا تو اسے بہت احترام سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، بابا فریدؒ پر گفتگو شروع کی اور چند منٹ بعد ایسا لگا کہ وہ کہیں اور ہیں، انہوں نے اپنے میٹھے اور دھیمے لہجے میں پاک پتن میں اپنی پہلی حاضری کی روداد سنائی، یہ روداد ان کی کتاب "تاریخ اسلاف" میں درج ہے جو ۶۴-۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی اور پھر یہی روداد ان کی اہم اور مختصر کتاب "فضل کبیر" میں بھی

دہرائی گئی ہے جو ڈاکٹر صاحب کی حیات میں ہی ۱۹۹۹ء میں طبع تو ہوگئی تھی لیکن ان کی ہدایت کے بہ موجب، اس کی تقسیم ان کے انتقال کے بعد کے لئے موخر کردی گئی تھی۔

۱۰/اگست ۱۹۹۵ء کو ڈاکٹر صاحب نے پاک پتن کی پہلی حاضری کے بارے میں جو کہا وہ ''فضل کبیر'' میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''ایک مرتبہ حضرت شاہ زوار حسین صاحب کی خدمت میں خیر پور ٹامی والا حاضر ہوا، میرے ساتھ علی گڑھ کے ہم جماعت دوست عبدالغنی اور کراچی کے سیٹھ عبدالغفار بھی تھے، وہاں سے ہم لوگ پاک پتن شریف حاضر ہوئے .... اس زمانے میں مزار شریف میں مغرب کی طرف ایک کھڑکی تھی، میں وہاں کھڑا ہوکر فاتحہ پڑھنے لگا تو بابا صاحبؒ نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، میں تڑپ گیا اور لوٹ پوٹ ہوگیا، میں ''اللہ! اللہ!'' کہہ کر شور کرتا رہا، اپنے قابو میں نہ تھا، بہت سے لوگ جمع ہوگئے لیکن میرا شور کم نہ ہوا، پھر جمعے کی اذان ہونے لگی تو طبیعت قابو میں آئی، ہم لوگ وضو کرکے اگلی صف میں بیٹھ گئے، عبدالغنی صاحب میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے .... وہ روحانیت کے قائل نہیں تھے لیکن اب جوں ہی انہوں نے مجھے پکڑا، ان پر بھی کیفیات طاری ہوگئیں اور وہ بھی بے قابو ہوگئے .... اور کہنے لگے کہ بھائی! آج مجھے روحانیت کا قائل ہونا پڑا''۔

۱۰/اگست ۱۹۹۵ء کو جب ڈاکٹر صاحب یہ روداد سنا رہے تھے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور موٹے موٹے آنسو ٹپ ٹپ ان کی بڑی بڑی اور انتہائی روشن آنکھوں سے ان کے بھرے ہوئے رخساروں پر گر رہے تھے، سب حاضرین پر رقت طاری ہوگئی، میں اس وقت ملازمتِ سرکار میں تھا، میں نے درخواست کی کہ اگر وہ کچھ وقت نکال سکیں تو بابا فریدؒ کے بارے میں میرے اس کتابچے کے پہلے اڈیشن میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشان دہی کردیں اور متن کے بارے میں رہنمائی کریں، ڈاکٹر صاحب اس وقت ۸۳ سال کے پیٹے میں تھے، ہر روز دعا کے طالبوں اور علم اور روحانیت کے طلب گاروں کا ازدحام لگا رہتا تھا جو رات تک جاری رہتا، اللہ کے اس دوست نے اپنی عدیم الفرصتی، پیرانہ سالی اور کمزوری کے باوجود، صرف ایک دو روز میں کتابچے کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف، کمال محبت اور محنت سے پڑھ کر ایک ایک شوشے اور نقطے تک کی جس عرق ریزی سے اصلاح کی اور کتابچے کے متن کے بارے میں مجھے جن بیش بہا مشوروں

سے نوازا، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔

۱۹۹۵ء کے بعد اس کتابچے کے مزید اڈیشن شائع ہوئے، ہر نیا اڈیشن نکلنے کے موقع پر میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا کہ اپنے ارشادات سے نوازیں اور ان کے یہ ارشادات ہر نئے اڈیشن کا جھومر بنتے اور اسے برکت دیتے، ڈاکٹر صاحب نے مجھے جو چند خطوط لکھے، اس میں یہ فقرہ، ان کی پاکیزہ تحریر میں، خط کے آخر میں ہوتا تھا: ''یقین جانیے آپ کے لئے ہر روز دعا کرتا رہتا ہوں'' یا یہ لکھا ہوتا: ''یقین جانیے کہ بلا ناغہ تہجد کے وقت آپ لوگوں کے لئے دعا کرتا رہتا ہوں''، ایک دفعہ میں نے انہیں لکھا تھا کہ اپنی والدہ کے گزر جانے کے بعد میں سوچتا تھا کہ اب دنیا میں کون راتوں میں میرے لئے دعائیں کرے گا، میں بھی کتنا بے خبر تھا؟۔

ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۲۰۰۵ء کو اسی گھر میں ہوئی جہاں ۱۰/اگست ۱۹۹۵ء کو پہلی حاضری ہوئی تھی، تب گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں اور اب سردیاں عروج پر تھیں، ڈاکٹر صاحب صحن کی بجائے ساتھ والے کمرے میں پلنگ پر بیٹھے تھے، ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں، میں نے اس بار ڈاکٹر صاحب کی یادگار تصنیف ''تاریخ اسلاف'' پیش کی اور درخواست کی کہ اگر زحمت نہ ہو تو اس پر اپنے دستخط کردیں، انہوں نے مجھ سے میرا قلم لیا اور دستخط کئے اور نیچے ۱/۱/۰۵ء لکھا، یہ تحریر دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک انتہائی ضعیف، بیمار اور ۹۲ سالہ شخص کی تحریر ہے جس کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔

۲۵/ستمبر ۲۰۰۵ء کو مغرب کے وقت، حیدر آباد (سندھ) سے چند کلومیٹر دور ان کے مقام تدفین پر ہزاروں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے جمع تھے جو نہ صرف حیدر آباد (سندھ) بلکہ کراچی، اندرون سندھ اور پنجاب سے آئے تھے، لگتا تھا کہ جس نے جب اور جہاں یہ خبر سنی وہ اسی حال میں اٹھا اور سیدھا حیدر آباد کی طرف چل دیا، کراچی سے حیدر آباد جانے والی سپر ہائی وے کے دونوں جانب، تاحدِ نگاہ، بسوں، ویگنوں اور کاروں کی قطاریں صف باندھے کھڑی تھیں، پولیس نے لاکھ کوشش کی لیکن اس رات اس قومی شاہ راہ پر ٹریفک گھنٹوں معطل رہی۔

وہ آفتاب عالم تاب جو ۹۳ برس پہلے جبل پور میں طلوع ہوا تھا، آج ۴۰-۱۲ بعد از دوپہر حیدر آباد میں غروب ہوگیا تھا، مغرب کی نماز کے بعد ان کا پاک جسم ان کی معطر لحد میں اتار دیا گیا،

نوے برس پہلے ایک ماں نے اپنے تین سالہ بیمار بیٹے سے کہا تھا: ''میرے بچے! قرآن پڑھو، اللہ نے چاہا تو ٹھیک ہو جاؤ گے''، آج اس معصوم روح کو اس کے پالن ہار نے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے دی۔

مولانا صفی الرحمان مبارک پوری

بہ روز جمعہ یکم دسمبر ۲۰۰۶ء کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے سابق امیر اور صاحب الرحیق المختوم مولانا صفی الرحمان مبارک پوری نے داعی اجل کو لبیک کہا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

ضلع اعظم گڈھ میں مبارک پور پارچہ بافی کی صنعت کے لئے ایک مشہور قصبہ ہے جو علمی و تعلیمی حیثیت سے بھی ممتاز ہے اور یہ بعض بڑے علما و مصنفین کا مولد و مسکن بھی رہا ہے، مبارک پور سے متصل جانب شمال میں حسین آباد کی بستی میں مولانا صفی الرحمان صاحب ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے جامعہ فیض عام مئو سے درس نظامی کی تحصیل کی اور اسی دوران الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات مولوی اور عالم بھی پاس کئے، تعلیمی مرحلہ ختم کرنے کے بعد کئی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۷۱ء کی ہند و پاک کی جنگ کے زمانے میں وہ جامعۃ الرشاد سے وابستہ تھے، اس زمانے میں دارالمصنفین اکثر آتے اور کتب خانے سے استفادہ کرتے، مجھ سے اور مولوی ابوعلی عبدالباری صاحب مرحوم سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے اور مختلف علمی، دینی اور قومی و سیاسی مسائل پر گفتگو کرتے، اس سے ان کی ذہانت، قوت گویائی، اچھی صلاحیت اور مسائل حاضرہ سے باخبری کا اندازہ ہوتا، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

مگر جامعۃ الرشاد سے ان کا تعلق بہت کم عرصے تک رہا اور بالآخر وہ اپنی اصلی جگہ پہنچ گئے یعنی جامعہ سلفیہ بنارس میں درس و تدریس کی خدمت انہیں تفویض کی گئی، یہاں ان کی مخفی صلاحیتیں جلا پانے لگیں، تقریر و خطابت کا ملکہ تو پہلے ہی سے ان میں نمایاں تھا، یہاں آکر قلم نے بھی گل کاریاں شروع کیں تو جامعہ کے ماہانہ رسالہ ''محدث'' کی ادارت کی ذمہ داری ان کو سپرد کی گئی جسے انہوں نے حسن و خوبی سے انجام دیا، بعض کتابوں کے ترجمے کئے، رد و مناظرہ میں

رسائل بھی لکھے، اس سے پہلے انہیں عربی بولنے اور لکھنے کی مشق و ممارست نہ تھی، یہاں آکر عربی لکھنے اور بولنے پر بھی قدرت حاصل ہوگئی۔

مولانا صفی الرحمان مبارک پوری کی شہرت کا غلغلہ اس وقت مچا جب انہوں نے رابطۂ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے انعامی مقابلے کے لئے سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام پر ''الرحیق المختوم'' کے عنوان سے اپنا مقالہ سپرد قلم کیا جو دوسرے مقالوں سے فائق ہونے کی بنا پر پہلے انعام کا مستحق قرار پایا، پچاس ہزار ریال کا یہ انعام ۱۹۷۹ء میں انہیں ایک باوقار تقریب میں مکہ معظمہ میں اس کے نائب گورنر امیر سعود بن المحسن کے ہاتھوں دیا گیا۔

رابطہ کے انعام سے ان کا آوازۂ شہرت دوسرے ملکوں میں بھی بلند ہو گیا اور وہ امریکہ، برطانیہ، خلیج کی ریاستوں اور پاکستان میں بھی دعوتی اور تبلیغی تقریروں کے لئے مدعو کئے جانے لگے اور ہندوستان میں بھی کئی جگہوں کے دعوتی اسفار کئے، ان کی اہمیت بڑھی تو انہیں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کا امیر منتخب کیا گیا مگر ملک سے باہر قیام کی وجہ سے وہ خود اس بڑے منصب سے جلد ہی سبک دوش ہو گئے۔

''الرحیق المختوم'' کی گراں مایہ تصنیف نے ان کے لئے سرزمین عرب میں قیام کی راہ ہموار کر دی جو بڑی سعادت اور خوش نصیبی کی بات تھی، پہلے تو مدینہ یونی ورسٹی کے شعبہ مرکز السنۃ والسیرۃ النبویہ میں ان کا تقرر ہوا، یہاں وہ سیرت نبویؐ سے متعلق تاریخ و حدیث کے مواد کی تحقیق و تنقیح کا کام انجام دیتے تھے، جب یہ معاہدہ ختم ہوا تو ریاض کے مکتبۃ السلام کے سربراہ مقرر کئے گئے اور مدۃ العمر اس سے تعلق باقی رکھا، دارالسلام سے ان کی شاہ کار تصنیف ''الرحیق المختوم'' کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے، یہیں انہوں نے اس کتاب کا اختصار ''روضۃ الانوار فی سیرۃ النبی المختار'' کے نام سے میٹرک تک کے طلبہ کے لئے کیا تھا اور خود ہی اس کا اردو ترجمہ ''تجلیات نبوت'' کے نام سے کیا تھا، یہ کتاب بھی مقبول ہوئی اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کی گئی۔

دارالسلام کے ایک پروجیکٹ ''موسوعۃ الحدیث النبوی الشریف'' کے تحت صحاح ستہ کو ایک جلد میں شائع کرنے کا پروگرام بنا جس کے نگراں سعودی عرب کے وزیر مذہبی

امور صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ تھے تو انہیں اس کی تصحیح و مراجعت کا کام سپرد کیا گیا۔

مولانا نے احادیث کی بعض کتابوں کی شرحیں بھی لکھیں، مسلم شریف کی شرح منة المنعم فی شرح مسلم اور بلوغ المرام کی اتحاف الکرام فی شرح بلوغ المرام لکھی مولانا محمد سورتی نے عربی اشعار کا ایک منتخب مجموعہ ازھار العرب کے نام سے تیار کیا تھا، اس کی بھی شرح لکھی تھی۔

انہوں نے کئی عربی کتابوں کے اردو ترجمے کئے تھے جیسے المصابیح فی مسئلة التراویح للسیوطی، کتاب الاربعین للنووی، الکلم الطیب لابن تیمیة، تذکرة الشیخ محمد بن عبدالوهاب النجدی للقاضی الشیخ احمد بن حجر۔

ان کی بعض اردو تصانیف کے نام یہ ہیں:

صحف یہود و نصاریٰ میں آنحضرت ﷺ کی بشارتیں، تاریخ آل سعود، قادیانیت اپنے آئینے میں، فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرت سری وغیرہ۔

مولانا کی صحت اچھی تھی، چند برس پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا مگر اس میں سنبھل گئے، آخر وقت موعود آ گیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ ''ض''

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

سہ ماہی العلم الطاف نمبر: مدیر سید مصطفیٰ علی بریلوی علیگ، کاغذ و طباعت معتدل، صفحات ۱۳۶، قیمت: ۶۰ روپے، زرسالانہ: ۲۰۰ روپے، پتہ: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس شارع سید الطاف علی بریلوی (علیگ)، ۱-ج، ۴۵/۱۰، ناظم آباد، کراچی (۷۴۶۰۰)۔

سید الطاف علی بریلوی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے مایہ ناز فرد تھے، علم و تعلیم سے ان کو بڑا شغف تھا اور وہ علمی و تعلیمی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، شروع میں اپنے وطن بریلی کے تعلیمی اداروں سے منسلک اور ان کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز رہے، علی گڑھ پہنچے تو وہاں کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور مدتوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے وابستہ رہے، اس کے سکریٹری اور رسالہ مصنف علی گڑھ کے ایڈیٹر بھی رہے، ۱۹۵۱ء میں کراچی گئے تو آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی اور اس کے بھی سکریٹری ہوئے اور سہ ماہی ''العلم'' جاری کیا جو کانفرنس کا ترجمان تھا، سرسید گرلز کالج کا قیام بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے، انہوں نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی ترقی و توسیع کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا، اس کا کتب خانہ، دارالمطالعہ، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ اور اس کے گوناگوں شعبے ان ہی کی محنت اور جد و جہد سے وجود میں آئے، ان کے علاوہ تذکرہ و سوانح، سائنس، اخلاقیات، ادبیات، نفسیات اور دوسرے موضوعات پر مفید اور معیاری کتابیں شائع کیں، ان کی وفات کے بعد ان کے برادر عم زاد سید مصطفیٰ علی بریلوی ان کے مشن کو فروغ دینے میں لگے ہوئے ہیں، العلم بھی ان ہی کی ادارت میں نکل رہا ہے، یہ اس کا خاص نمبر ہے جو اگرچہ تین حصوں پر مشتمل ہے، تاہم اس کا ایک حصہ سید الطاف علی کے لئے خاص کیا گیا ہے جس میں ان سے متعلق بہت سارا مواد اکٹھا کیا ہے جیسے سید الطاف علی یادگاری جلسہ

کی رپورٹ اور ان پر متعدد مضامین، ان کے خطوط دوسروں کے نام اور دوسروں کے خطوط ان کے نام، ان کی بعض تحریریں اور مضامین وغیرہ، ان کے علاوہ اس شمارہ میں ''انگریزی نظام تعلیم سے مسلمان کیوں علاحدہ رہے؟''، ''سفر امریکہ''، ''اردو کا سفر'' وغیرہ اچھے اور معلوماتی مضامین ہیں، رسالہ العلم کے عام شمارے بھی علمی، تعلیمی، ادبی اور معلومات افزا مضامین سے آراستہ ہوتے ہیں، یہ نمبر اپنی بعض کمیوں کے باوجود خاصے کی چیز ہے۔

پندرہ روزہ ترجمان، علمائے اہل حدیث کنونشن نمبر: مرتبہ رضاء اللہ عبدالکریم مدنی، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۲۶، قیمت: ۷ روپے، زر سالانہ: ۱۵۰ روپے، پتہ: مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، اہل حدیث منزل، ۴۱۱۶، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی، ۱۱۰۰۰۶۔

سال گزشتہ جمعیۃ اہل حدیث ہند نے ایک ہی ساتھ تین پروگرام کئے تھے، سمپوزیم، سمینار اور کنونشن، اس میں سب سے مفید ومقبول پروگرام سمپوزیم کا رہا، جس کا مقصد اس داغ کو مٹانا تھا کہ ''مدارس اسلامیہ دہشت گردی کے اڈے ہیں'' یا ''وہ دہشت گرد پیدا کرتے ہیں''، مقررین نے بتایا کہ مدارس اسلامیہ امن وامان کا گہوارہ ہیں، ان کا کام اسلامی تعلیم کو رائج کر کے ساری دنیا میں امن وامان قائم کرنا ہے، اس میں مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ نے فرمایا کہ مدارس اسلامیہ دہشت گردی کے مراکز نہیں بلکہ امن وامان کے گہوارے ہیں، وہ امن و سلامتی پھیلانے اور قائم کرنے کا پیغام اور ترغیب دیتے ہیں، سابق وزیر اعظم وی-پی سنگھ اور وزیر مملکت برائے امور خارجہ نے بھی اپنے خطاب میں ان ہی خیالات کا برملا اظہار کیا، اس سمپوزیم کی کامیابی اور حاصل یہ رہا کہ غیر مسلم وزراء وزعما نے بھی مدارس کےخلاف پروپیگنڈے کی مذمت کی اور انہیں ملک وملت کا خدمت گار بتایا اور ان کی امن پسندانہ کوششوں کو سراہا۔

سمینار میں مندوبین نے مفید مقالے پڑھے، جن میں مدارس اور ان کے نصاب، نظام تعلیم وتربیت اور وسائل وغیرہ پر کھل کر بحث ومباحثہ ہوا۔

جمعیت کنونشن میں جمعیۃ کے اکابر علما نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جمعیۃ کے مقاصد اور آئندہ کا لائحہ عمل بتایا اور اس کی بعض خامیوں پر بھی توجہ دلائی۔

یہ خاص نمبر ان تینوں پروگرام میں ظاہر کئے گئے خیالات وافکار، خطابات وتقاریر اور پڑھے گئے مقالات وتاثرات کا مرقع ہے، نمبر کے تمام مقالے مفید، قابل قدر اور اپنے موضوعات کا پوری طرح احاطہ کئے ہوئے ہیں، ان سے اسلام اور مسلمانوں پر عائد کردہ دہشت گردی اور ملک دشمنی کے الزام کے ازالے میں بڑی مدد ملے گی اور ان سے اہل ملک کی غلط فہمی بھی دور ہوگی۔

ماہ نامہ راہِ اعتدال، اسلام اور دہشت گردی نمبر: مرتبہ مولانا حبیب الرحمان اعظمی عمری، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۱۶، قیمت: ۳۵ روپے، زر سالانہ: ۱۰۰ روپے، پتہ: راہ اعتدال، جمعیت ابنائے قدیم جامعہ دارالسلام، عمرآباد-۶۳۵۸۰۸، جنوبی ہند۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد جنوبی ہند کی مشہور قدیم درس گاہ ہے، ماہ نامہ راہِ اعتدال اس کی جمعیت ابنائے قدیم کا مفید، دینی، دعوتی اور اصلاحی رسالہ ہے، اب اس نے موجودہ وقت کے ایک اہم موضوع پر یہ خاص نمبر نکالا ہے، اس میں ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو اسلام پر دہشت گردی کا الزام عائد کررہے ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ اسلام کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کی بنیاد امن وسلامتی اور اخوت پر رکھی گئی ہے اور اس نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے جو لوگ اسلام پر یہ تہمت عائد کررہے ہیں اور اس کو ظلم وجارحیت کا مذہب قرار دے رہے ہیں وہ خود ہی سب سے بڑے دہشت گرد ہیں۔

یہ نمبر تقریباً ڈھائی درجن مقالات کا مجموعہ ہے، شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن محمد آل الشیخ کا مضمون ''دہشت گردی (تعریف وتجزیہ)'' کلیدی حیثیت کا حامل ہے، اس میں پہلے مختلف پہلوؤں سے دہشت گردی کی تعریف کی گئی ہے پھر اس کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے اس کی وہ سزا بھی بیان کی گئی ہے جو دہشت گردی کے مرتکبین کے لئے اسلام نے تجویز کی ہے، ایک مقالہ ''دہشت گردی کی تاریخ'' (ڈاکٹر سلیمان عمری) میں بتایا گیا ہے کہ اس کی ابتدا حضرت مسیح کی پیدائش سے کئی سو برس پہلے ہوگئی تھی، انہوں نے جہاد اور دہشت گردی کا فرق بھی اچھی طرح واضح کردیا ہے۔

ماہ نامہ راحت وصحت، قلب نمبر: مرتبہ ڈاکٹر جوہر قاضی، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۴۵۶، قیمت: ۱۰۰ روپے، زر سالانہ: ۱۲۰ روپے، پتہ: منیجر راحت وصحت ۱۱۸۶، کلاں محل دریا گنج، نئی دہلی-۲۔

آج دنیا جتنی تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے اسی رفتار سے وہ نئے نئے امراض و مشکلات کا شکار بھی ہے، انسان مادی ترقی و کامیابی کو حاصل کرنے میں اتنا زیادہ منہمک ہے کہ وہ اپنے جسمانی حقوق کو بالکل ہی نظر انداز کر بیٹھا ہے، یہاں تک کہ اپنے کھانے، پینے، مناسب وقت پر آرام کرنے سے بھی بے پرواہ ہوگیا ہے، اسی ذہنی انتشار اور پراگندگی کی وجہ سے لوگ بہ کثرت امراض قلب میں مبتلا ہوکر موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

ماہ نامہ راحت وصحت کا یہ قلب نمبر آج بیمار دنیا کے لئے بہترین تحفہ ہے، یہ ماہرین فن اور فاضل اطبائے کرام کے مفید اور کارآمد مضامین پر مشتمل ہے جن میں گراں اور ناقابلِ برداشت علاج سے بچنے اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے لئے زریں مشورے دیئے گئے ہیں، یہ نمبر تین درجن سے زیادہ مضامین کا مجموعہ ہے جو ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، اس کا ہر مضمون صحت ومرض سے متعلق مفید اور ضروری ہدایات کا گنجینہ ہے۔

ششماہی علوم القرآن، قرآنی علوم بیسویں صدی میں سمینار نمبر: مرتبہ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی و ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۵۳۲، پتہ: ادارۂ علوم القرآن، پوسٹ باکس نمبر ۹۹، سرسید نگر، علی گڑھ۔

علی گڑھ سے وابستہ بعض فضلائے مدرسۃ الاصلاح نے وہاں ادارۂ علوم القرآن کی داغ بیل ڈالی ہے، ششماہی علوم القرآن اسی کا آرگن ہے جو تقریباً ربع صدی سے قرآنی خدمت انجام دے رہا ہے، جنوری ۲۰۰۵ء میں ادارہ نے ”قرآنی علوم بیسویں صدی میں“ کے عنوان سے ایک سمینار کرایا تھا، یہ خاص نمبر اس میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو طلبۂ قرآن کے مطالعہ کے لائق ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔　　ت-۱

❋❋❋❋

مطبوعات جدیدہ

غالب کی تخلیقی حسیت: از پروفیسر شمیم حنفی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش صفحات ۲۹۳، قیمت: ۲۰۰ روپئے، پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب مارگ نئی دہلی نمبر ۲۔

جناب شمیم حنفی اردو کے معروف نقاد اور بڑے استاد ہیں اور ان دونوں حیثیتوں سے غالب سے ان کا رشتہ ظاہر ہے، لیکن نقادوں کی معروف غیر جانب داری یا معروضیت کے برخلاف غالب سے ان کا معاملہ طرف داری کا ہے، اور یہ سخن فہمی کے اثبات کے ساتھ بھی ہے، انہوں نے صاف اعتراف پہلے ہی کرلیا کہ غالب کی شاعری ان کے لئے فیضان کا مستقل سرچشمہ ہے، بلکہ غالب کے بغیر ان کو اپنی دنیا ادھوری اور خام محسوس ہوتی ہے کہ نہ تو اس کی تعبیر کا سلسلہ کہیں رکتا ہے اور نہ گنجینہ معنی کا یہ طلسم کبھی ٹوٹتا ہے، حالاں کہ ان کو یہ احساس ہے کہ غالب کے بارے میں لکھنا اور باتیں کرنا ایک عام مشغلہ سا ہوگیا ہے اور حد یہ ہے کہ اردو معاشرے سے دور کا تعلق رکھنے والے یا محض سنی سنائی معلومات رکھنے والے بھی غالب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں، شاید اسی لئے فاضل مصنف نے یہ رائے قائم کی کہ غالب کے متعلق تنقیدی سرمایہ وافر ہونے کے باوجود حیرت انگیز حد تک غیر معقول ہے، ایک نقاد کی اس رائے سے بھی انہوں نے موافقت ظاہر کی، کہ اردو میں صرف دو اچھے مضمون ہیں، ایک حمید احمد خاں اور دوسرا ڈاکٹر آفتاب احمد کا، اس سے غالب کی عظمت سے زیادہ تنقید کے عجز کی انہوں نے شکایت کی ہے، حنفی صاحب کا یہ تاثر ممکن ہے کہ کچھ زیادہ ہی سخت بلکہ انتہا پسند ہو، اگر کسوٹی یہی ہے کہ کسی فن پارے کی وضاحت کم سے کم اس طرح ہو کہ فن پارے کی انفرادیت کا احساس پیدا ہو جائے، تو اس کسوٹی پر غالب کے نقاد کسی نہ کسی درجے پر پورے اترتے نظر آتے ہیں، خواہ وہ مدح کی شکل ہو یا قدح کی، اس کتاب میں بھی یہی کوشش ہے جو چار فصلوں یعنی غالب کے پیش رو، غالب کا زمانہ، غالب ایک محشر خیال اور غالب ہمارا عہد، کے ذیلی مضامین میں مختلف عنوانوں سے پھیلی ہوئی ہے، اصلاً یہ بیس برسوں میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، سودا، درد، میر اور مصحفی کا انتخاب غالب کے پیش رو شعرا کی حیثیت سے شاید اسی لئے ہے کہ غالب کے شعور، تخیل اور

احساس کی تشکیل یا تکمیل میں مذکورہ شعرا کے اثرات کی نشان دہی کی جاسکے، لیکن ایک میر کے سوا اور تینوں شاعروں کے ذکر میں ایسا کوئی اشاریہ نظر نہیں آتا، استاد ذوق کا ذکر غالب کے ہم عصر شاعر کی حیثیت سے ہے اور اس اعتراف کے ساتھ ہے کہ ذوق کو جو شہرت اور قبولیت ملی وہ بڑے اور عہد آفریں شاعر کے حصہ میں آتی ہے لیکن معاً بعد یہ جملہ ناقابل فہم نظر آتا ہے کہ ذوق کو بڑا شاعر رسماً اور تعظیماً بھی نہیں کہا جاسکتا، مضمون کے آخر میں پھر یہ اعتراف قاری کی الجھنوں میں اضافہ ہی کرتا ہے کہ ذوق کا کردار ہماری ادبی تاریخ میں غیر معمولی ہے، ایک مضمون غالب کا طرز احساس اور سماجی شعور کا مسئلہ ہے، یہ شاید اس مجموعہ مضامین کی سب سے موثر تحریر ہے، کتاب کا نام بھی یہی ہوتا تو شاید تخلیقی حسیت سے زیادہ بہتر ہوتا، یہ کہنا کہ غالب نے آنکھ بند کرکے آئین روزگار کی پیروی نہیں کی اور یہ کہ پرانے مسلمات کی طرح اپنے عہد کی ایجادات کو انہوں نے نہ تو تمام وکمال قبول کیا، نہ اپنی شخصیت اور شعور کی وضع بدلی، دراصل غالب کے متعلق پھیلی یا پھیلائی گئی ایک سخت غلط فہمی کا ابطال ہے، غالب کی شاعری کا یہ مطالبہ یقیناً جائز ہے کہ اس کا مطالعہ جدید دور کے بعض مروج موضوعات اور ان کے معروف اور سوقیانہ تصورات سے الگ ہوکر کیا جائے، طرف داری کے مثبت دلائل کے باوجود یہ مجموعۂ مضامین غالب کی تصویر کو ایک جدا رنگ میں پیش کرنے میں کامیاب ہے، اس مستقل اور مستحکم نظریے کا وجود، بیس سے زیادہ مضامین کی اساس ہے، اس لئے مضامین کی تکرار، ناگوار ہی سہی، ناگزیر ہے، گویا کے ساتھ کہ لاحقہ کے جواز سے قطع نظر اس کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے، بعض تعبیریں مثلاً واحد المرکز، عیش نہیں کئے، احساسات، ممکن ہوسکتا تھا، صفتی تغیر، کھلی ڈلی نثریت، وغیرہ محل نظر ہیں۔

تحفہ اہل النظر فی مصطلح اہل الخبر: از جناب مولانا ابو معاذ عبدالجلیل اثری، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۳۲۰، بلا قیمت، پتہ: ندوۃ المصنفین گجراں والا، پاکستان۔

علم حدیث میں روایتوں اور راویوں کے مقام و مرتبہ اور قوت و ضعف جاننے کے لئے عربی زبان میں ایک زمانے سے اور بہتر سے بہتر کتابیں موجود ہیں، اردو میں بھی طلبہ علوم حدیث کے لئے اور عام قارئین کے لئے بھی کچھ کتابیں مرتب کی گئیں، زیر نظر کتاب بھی اسی کوشش کا یقیناً زیادہ مفصل اور وقیع حصہ ہے، جس میں احادیث شریفہ کے تمام اقسام کی تعریف کے علاوہ کتب حدیث اور مشہور محدثین کا تعارف بھی آگیا ہے، طلبہ کے لئے یہ خاص طور پر بڑی کارآمد کتاب ہے۔ ع۔ص

علامہ شبلی نعمانیؒ کی تصنیفات

کتاب	مصنف	Pages	Rs
۱۔سیرۃ النبیؐ اول (مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	512	190/-
۲۔سیرۃ النبیؐ دوم (مجلد اضافہ شدہ کمپیوٹر ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	520	190/-
۳۔مقدمہ سیرۃ النبی	علامہ شبلی نعمانی	74	30/-
۴۔اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	علامہ شبلی نعمانی	146	85/-
۵۔الفاروق (مکمل)	علامہ شبلی نعمانی	514	95/-
۶۔الغزالی (اضافہ شدہ ایڈیشن)	علامہ شبلی نعمانی	278	120/-
۷۔المامون (مجلد)	علامہ شبلی نعمانی	248	65/-
۸۔سیرۃ النعمان	علامہ شبلی نعمانی	316	130/-
۹۔الکلام	علامہ شبلی نعمانی	324	65/-
۱۰۔علم الکلام	علامہ شبلی نعمانی	202	35/-
۱۱۔مقالات شبلی اول (مذہبی)	مولانا سید سلیمان ندوی	236	65/-
۱۲۔مقالات شبلی دوم (ادبی)	مولانا سید سلیمان ندوی	108	25/-
۱۳۔مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	مولانا سید سلیمان ندوی	180	32/-
۱۴۔مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	مولانا سید سلیمان ندوی	194	35/-
۱۵۔مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	مولانا سید سلیمان ندوی	136	25/-
۱۶۔مقالات شبلی ششم (تاریخی)	مولانا سید سلیمان ندوی	242	50/-
۱۷۔مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	مولانا سید سلیمان ندوی	124	25/-
۱۸۔مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	مولانا سید سلیمان ندوی	198	55/-
۱۹۔خطبات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	190	35/-
۱۹۔مکاتیب شبلی (اول)	مولانا سید سلیمان ندوی	360	40/-
۲۰۔مکاتیب شبلی (دوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	264	35/-
۲۱۔سفرنامہ روم و مصر و شام	علامہ شبلی نعمانی	238	80/-

۲۲۔شعرالعجم (اردو) (اول ص 274 قیمت 85/-) (دوم ص 214 قیمت 65/-) (سوم ص 192، قیمت 35/-)
(چہارم ص ، قیمت) (پنجم ص 206، قیمت 38/-) (کلیات شبلی ص 124، قیمت 25/-)